www.iqbalkalmati.blogspot.com
احمد ندیم قاسمی

سناٹا

از

احمد ندیم قاسمی

بہت پیارے
گلزار
کے نام
جو فلمی ہدایت کاری، گیت
نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر
فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک
بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

فہرست

رئیس خانہ

خاکستری رنگ کے پتھروں کی اس عمارت کو بڑے لوگ مسافر خانہ اور چھوٹے لوگ رئیس خانہ کہتے تھے۔ شائد اس لئے کہ بڑے لوگوں کے لئے ڈاک بنگلہ موجود تھا اور چھوٹے لوگ سرائے میں ٹھہرتے تھے۔ جہاں صبح اور شام کو وہ بھٹیارے کے پاس تنور کے اردگرد بیٹھ کر موٹی موٹی روٹیوں پر دال کی ڈھیریاں لگا کر کھاتے، رئیس خانے کے چوکیدار کی بیوی مریاں اور ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے حسن کا مقابلہ کرتے اور چٹخارے بھرتے اور لگے ہاتھوں ایک نظر بھٹیارے کی بیوی پر بھی دوڑا لیتے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی ریاست کی رانی ہے اور بھیس بدل کر بھٹیارن بنی پھرتی ہے۔۔۔ اور ادھر رئیس خانے کا یہ عالم تھا کہ وہاں رئیس آتے ہی نہ تھے، لے دے کے کبھی کبھار شکاری نوجوانوں کی کوئی ٹولی ہرنوں کی تلاش میں یہاں آنکلتی تو رئیس خانے میں رک جاتی۔ اس روز فضلو چوکیدار بڑی امیدوں سے چھت کے جالے اتارتا۔ برآمدے کے گوشوں میں پڑی ہوئی پتا ور کو باہر پھینکتا اور اکلوتے گلدان کے بدبودار پانی اور جلے ہوئے پھولوں کو گرا کر ڈاک بنگلے کے مالی سے نئے پھول مانگ لاتا۔ اور جب شکاری رخصت ہو جاتے تو فضلو کو دوسری عمارتوں کے سب چوکیدار پرلے درجے کے جھوٹے اور مکار نظر آنے لگتے جو اسے بڑی بڑی ''بخششوں'' کے قصے سناتے اور بتاتے کہ جتنے روز وہ صاحب ان کے ہاں رکے ہیں انہوں نے پلاؤ، فیرنی اور قورمے کے سوا اور کوئی چیز چکھی ہو تو ان کی زبان پر پھوڑا نکلے۔ فضلو مریاں سے ان چوکیداروں کی لافوں کا ذکر کرتا تو وہ کہتی، ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کی بیویوں، بیٹیوں کو کبھی دیکھا ہے تم نے؟ ایسا ریشم پہنتی ہیں کہ بالکل پٹیالے کی رانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ فاطمہ چوکیدارن آج چشمے پر کپڑے دھونے آئی تھی، میں نے کہا فاطمہ! شرم نہیں آتی، ننگے سر چشمے پر چلی آئیں! پہلے تو وہ زور سے ہنسی پھر مجھے پاس بلا کر بولی! اور تمہیں شرم نہیں آتی کہ میں نے سو روپے کا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے اور تم مجھے ننگے سر دیکھ رہی ہو اور میں نے غور سے دیکھا تو فضلو اس نے ایسا مہین دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا کہ مکڑی کا جالا کیا چیز ہے۔ وہ بچھو کی سی مونچھوں والا ایک صاحب آیا تھا نا۔ جس کی بیوی بچوں کی جگہ کتے پالتی تھی، وہی دلوا گیا بیوی سے۔ اور یہاں ہمارے صاحب رئیس خانے کی صابندانی ہی چرا لے گئے اور وہ شکاری رئیس شیرو کو ایک چوونی دے گئے تھے کٹے ہوئے کنارے والی حرام زادے۔

''سور کے بچے!'' فضلو مریاں کی تائید کرتا۔

یہ رئیس خانہ کوہستان کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھند میں لپٹا پڑا رہتا اور دور سے یوں نظر آتا جیسے کہ کوئی بڈھا مہینوں سے نہیں نہایا۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے جنگلوں کی چمنیوں پر الو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔ بنگلوں کی پہلو کی کوٹھریوں میں چوکیدار اور ان کے بیوی بچے دوپہر تک کھاٹوں کھٹولوں پر پڑے سکڑا کرتے اور پھر دھوپ کی ڈھنڈیا پڑی رہتی لیکن جونہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلا اٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی، چوکیداروں کی بیویاں اور بچے جالے اتارتے اور شیشے دھوتے، مالی باغیچوں میں سے خزاں کا ملبہ اٹھاتے اور قسم قسم کی پنیری لگاتے۔ دکاندار میدانوں کو چھوڑ کر خچروں پر دکانوں کا سامان لادے اوپر آجاتے، شام ہوتے ہی بنگلوں کے پہلو میں دبکی ہوئی کوٹھریوں کی کھڑکیاں جاگ اٹھتیں اور ہر طرف عیدرات کی سی ہماہمی طاری ہو جاتی۔

اور پھر بڑے بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے خاندان لمبی لمبی موٹروں میں بھرے ہوئے سکیسر کی چکراتی ہوئی سڑکوں پر تیرتے ہوئے آتے۔ چوکیداروں اور مالیوں کے بچے موٹروں کے شیشوں میں سے امیر لوگوں کے گورے گورے بچوں کو دیکھتے تو ان کے پیچھے بھاگتے اور جب موٹر کسی بنگلے میں چلی جاتی تو وہ گیٹ سے لگ کر منہ کھولے کھڑے ہو جاتے اور جب امیر بچے کاروں سے اترتے اور اتفاق سے ان کی نظر گیٹ کی طرف اٹھ جاتی تو چند جری قسم کے غریب بچے فوراً سلام کرتے، ادھر سے سلام کا جواب مل جاتا تو وہ شرمیلے اور بزدل بچوں کی طرف سے فخر سے دیکھتے اور کہتے ''دیکھا ہمیں سلام کا جواب ملا ہے۔ اب ہمیں بلے اور گیندیں اور پرانے بوٹ ملیں گے انعام میں، اور تم بیٹھے دیکھا کرنا۔ سو رو بڑے آدمیوں کو جھک کر سلام کرنا چاہئے، بڑا ثواب ملتا ہے۔''

افسروں کے بعد ڈاک بنگلوں میں قسم قسم کے صاحب آتے چند روز کیلئے رکتے اور پھر چوکیداروں اور مالی میں بخششیں بانٹتے میدانوں میں اتر جاتے، چند لوگ عالی جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کے سلام کا فخر حاصل کرنے آتے، چند جاگیروں کے مقدمات کے سلسلے میں چند گھی کے کنستر، انڈوں کی ٹوکریاں اور بٹیروں کے پنجرے ڈالی کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں۔۔۔۔ ان میں سے بہت کم تعداد ایسے صاحبوں کی ہوتی جو محض سکیسر کو دیکھنے آتے، کبھی کبھی جوگیوں کی ٹولیاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سکیسر کی گھاٹیوں میں رینگتی ہوئی اوپر آتیں تو رات سرائے میں ٹھہر کر صبح کو پہاڑ کی دوسری طرف اتر جاتیں یا نوجوان شکاری ہرنوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے سکیسر کے قریب پہنچتے تو دور سے چمکتے ہوئے بنگلوں اور چمنیوں سے نکلتی ہوئی نیلے دھوئیں کی دھاریاں دیکھ کر اوپر آجاتے، یہاں وہ رات رئیس خانے میں گزارتے اور چوکیدار کی آنکھ بچا کر منہ اندھیرے ہی نیچے اتر جاتے۔

''سور کے بچے!'' فضلو ان صاحبوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا۔

''حرامزادے!'' مریاں ان کے بارے میں رائے ظاہر کرتی۔

ایسے شکاریوں میں نے کسی نے چپکے سے کھسکتے وقت رئیس خانے کی صابن دانی کو بھی اپنے تھیلے میں رکھ لینا مناسب سمجھا۔اسی لئے فضلو بے تحاشا حقہ پیتا،مریاں اس کے پاس بیٹھی ''ابابیلی'' پرسوت چڑھاتی یا شیرو کے سر سے جوئیں چنتی اور ہر جوں پر اسے ''حرامزادہ کہتی۔''

سکیسر کے مشرق میں پھیلی ہوئی وادی کو ''سون'' کہتے ہیں۔یہاں کے دیہات میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا ہے اور پھر وہاں سے اتر کر سون کے سبزازاروں پر برستا ہے۔سون والوں کی نظریں بارش کے انتظار میں بجائے آسمان کے سکیسر کی طرف اٹھتیں۔چھٹی پر آئے ہوئے فوجی جوان دوربینیں لگاتے چمکتے ہوئے سفید بنگلے قریب آجاتے۔گھنے درختوں کے جھرمٹوں میں کبھی کبھی کوئی کار رینگتی دکھائی دے جاتی لیکن انہیں تو چوٹی کے آس پاس کہرے کی اس دھجی کی تلاش ہوتی جو عموماً رات کی رات پھیل کر بادل بن جاتی تھی اور سکیسر کی بلندیوں کو دھو کر پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے دیہات کا رخ کرتی تھی جو سکیسر سے کچھ یوں نظر آتے تھے جیسے ذرا سی ٹھوکر سے سارا گاؤں ڈھلان پر سے پھسلتا ہوا میدان میں آرہے گا۔

لیکن اب کے ساون نے سکیسر کی چوٹی کے بجائے سون کے ایک گاؤں میں جنم لیا۔سکیسر والے نیچے وادی میں اور پہاڑیوں کے افق تک پھسلتے ہوئے طویل سلسلوں پر پانی برستا دیکھتے رہے اور سکیسر کے حصے میں صرف نم آلود ہوائیں آئیں۔جنوب اور مشرق میں پکھڑا اور سون کی ڈھلی ہوئی گھاٹیوں میں سے خنکی لپکتی اور سکیسر کے بنگلوں کے پردوں کو ایک پراسرار ہوا چھیڑتی جو کبھی گرم ہوتی،کبھی ٹھنڈی اور کبھی محض مرطوب۔اور بڑے لوگ بلندیوں پر دوربینیں لگائے نیچے وادیوں پر بدلیوں کی دوڑیں دیکھتے۔وادی کے حاشیئے کی پہاڑیوں کا پانی چاندی کی چادریں بن کر جھیل کی طرف بڑھتا۔ٹینس کے میدان میں بڑے لوگ کھیل بند کر کے سگریٹ پھونکتے اور جمائیاں لیتے اور جب وادی سے کوئی تیز جھونکا بھیگی ہوئی دھرتی کی خوشبو کو اوپر سکیسر کی طرف اچھال دیتا تو وہ انگڑائیاں لے لے کر نشیبوں کی طرف عجیب بے بسی سے دیکھتے جیسے ساون قانون کی زد میں آسکتا تو اسی وقت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نظر آتا۔

ان دنوں سکیسر کے ڈاک بنگلے میں ایک شخص قیام پذیر تھا۔نہ وہ کسی افسر کو ڈالی دینے آیا تھا نہ اس کا کوئی مقدمہ تھا۔وہ سکیسر پر ساون گزارنے آیا تھا اور ساون کی اس شرارت سے بہت اداس تھا کہ سون میں ندیاں بہہ رہی ہیں اور سکیسر کے چشمے تک خشک ہو چلے ہیں۔برسوں سے ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا تھا۔اس کئے وہ ساون شروع ہونے سے چند روز پہلے ڈاک بنگلے میں آگیا۔اور اب ساون کی ساتویں تاریخ تھی لیکن بارشیں نیچے نوشہرہ،اور اوچھالی کے دیہات میں ہو رہی تھیں اور یہاں سکیسر کی ویرانی بس گئی تھی۔وہ شخص دن بھر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا اور سگریٹ پیتا اور شام کو ٹینس کے میدان کے قریب سے گزرتا ہوا کھلاڑیوں سے بالکل بے نیاز آگے بڑھ جاتا۔رئیس خانے کے پہلو والی سڑک سے ہوتا ہوا نیچے اترتا،کچھ دیر کے بعد واپس آتا اور پھر ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی اور دو روشندان بہت رات تک چمکتے رہتے۔

فضلو کو ڈاک بنگلے کے مالی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ صاحب پچھلے سال بھی یہاں ساون گزارنے آیا تھا۔پھر ایک دن اس نے ڈاک بنگلے کی عمارت کی بہت مذمت کی اور کہا رئیس خانے کی عمارت کا جواب سکیسر میں نہیں۔ایسا دل کشا مقام تینوں ڈپٹی کمشنروں کی

کوٹھیوں کو بھی میسر نہیں آیا اور مالی نے صاحب کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ رئیس خانے کی عمارت ڈراؤنی حد تک بے رونق تھی۔ اس کی پشت پر جو پہاڑی تھی اس نے مغرب کا سارا منظر چھپا رکھا تھا اور اس کے مختصر سے صحن کے کنارے پر درخت اتنے گنجان تھے کہ نیچے وادی میں جھیل بھی جھکی ہوئی شاخوں میں سے بہت سے ستارے بن کر ہی جھلک پاتی تھی۔ دو سال سے یہ بات مشہور ہو چلی تھی کہ رئیس خانے میں بھوت بسنے لگے ہیں مالی کو صاحب کی بد مذاقی پر بہت افسوس ہوا تھا۔

''پھر وہ چلا گیا۔'' مالی نے کہا۔

''ساون گزار کر یا پہلے ہی۔'' فضلو کو دلچسپی ہو رہی تھی کیونکہ ایک مدت سے بعد کسی صاحب کے سلسلے میں رئیس خانے کا نام سنائی دے رہا تھا۔

مالی بولا۔''یہ تو یاد نہیں۔ بس وہی دن تھے جب تم ساس کی موت پر مریاں کو ساتھ لئے نیچے وادی میں اترے تھے۔ ایک دن تم گئے دوسرے دن صاحب نے پوری کار کرائے پر لی اور چلا گیا اور مجھے سو روپے بخشیش دے گیا۔''

''سو روپے!'' فضلو کی حالت غیر ہونے لگی۔''پر یہ ہے کون؟''

''کوئی بھی ہو۔'' مالی نے بے پروائی سے کہا۔''ہمیں اس سے کیا مطلب بخشیش سے ہے سو وہ ملی، سوچو تو ایک سو روپے، معمولی رقم نہیں، منہ میں سماتی ہے۔ ہاتھ میں ایک ہی بار نہیں اٹھائی جاتی۔''

''فضلو کی بھویں جڑ گئیں اور ماتھے پر ایک قوسی شکن ابھر آئی۔''ایک سو!'' اس نے کہا۔

''ہوش میں تو ہو؟''

''ارے بھئی ہاں۔۔۔۔۔ ہزار بار ہاں۔۔۔۔ پورے ایک سو۔۔۔۔ پانچ بیسیاں۔۔۔۔ چار پچیسیاں۔۔۔۔ اور پھر اتنا گرم اور نرم کمبل کہ ہاتھ لگاؤ تو جانو تازہ حلوہ چھو رہے ہو۔۔۔۔ یہ کمبل اس نے بہشتو کو دیا اور بہشتو کا کام یہ تھا کہ دو تین دن اس کے کمرے کے گلدان سجا دیئے اور ایک بار تولیہ دھو دیا۔۔۔۔ بس۔۔۔۔ کوئی اللہ والا ہے؟''

فضلو بخشیشوں کا ذکر سن کر چڑ جانے کا عادی ہو چکا تھا مگر مالی نے پہلے قرآن مجید کی اور پھر اپنی بیوہ بہن بہشتو کی قسم کھائی تو وہ کوئی غیر مرئی سا گولا نکل کر واپس اپنی کوٹھری میں آ گیا اور مریاں کو اس واقعے کا ذکر یوں سنایا جیسے مالی نے اس کے ہاتھ مریاں ہی کے لئے ساری تفصیل بھجوائی ہے۔ مریاں لسی کے پیالے میں نمک کی چٹکی گھولتے ہوئے کہا۔''میں تم سے پوچھتی ہوں فضلو کہ جب رئیس خانے کی چوکیداری میں ہمیں اڑتی دھول بھی نہیں ملتی تو یہاں سکیسر پر کیوں ٹنگے پڑے رہیں کیوں نہ نیچے سون میں جا کر پرانے بھاڑ جھونکیں، اتنے زمیندار پڑے ہیں کسی کی ڈیوڑھی تو مل ہی جائے گی۔ مہینے کے بیس چھلکوں میں سے ایک دو بھی بچ رہتے تو دوا دارو کے لئے اٹھا رکھتی۔ پر یہاں تو شیرو کی ایڑی میں کنکر اتر جائے تو ہسپتال کے سامنے گھنٹوں ٹنچر کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے۔ اور جب جا کر وہ حرامزادہ کمپونڈر ذرا سی ٹنچر لاتا ہے۔ حرامزادے نے مجھے محتاج پا کر ہی تو آنکھ مار دی تھی پچھلے سال۔''

فضلو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، مریاں نے کمپونڈر کی یاد دلائی تو آپے سے باہر ہو گیا۔ لپک کر کونے میں سے کلہاڑا اٹھایا اور

بولا۔"پچھلے سال بھی تم نے مجھے شیرے کا واسطہ دے کر روک دیا تھا۔مگر آج میں نہیں مانوں گا۔ایسے سور کے بچوں کو جواب نہ دیا جائے تو آج آنکھ ماری ہے کل ہاتھ ڈالیں گے۔۔۔۔جانے دو مجھے۔۔۔"

فضلو کی گرج کے جواب میں مریاں، مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔اس کے کلہاڑے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔"میں بھی تو چپ نہیں رہی تھی۔میں نے کہا تھا کہ بابو، ذرا اپنی ماں کو بھی آنکھ ماری ہوتی، ذرا اپنی بہن کو بھی ٹٹول لیا ہوتا۔حرامزدے مجھے آنکھ مارتا ہے مجھے، میں تو تجھ ایسے بیسوں کو خرید کر قیما کر ڈالوں۔۔۔میں بکتی جھکتی رہی اور وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہا اور کہتا رہا۔آہستہ بہن، ذرا آہستہ گالی دو۔ڈاکٹر سن لے گا۔مجھے تو ہنسی آ گئی تھی اس پر۔"

فضلو نے کلہاڑا تو چھوڑ دیا تھا مگر کمپونڈر کو، پھر سب بنگلے کے چوکیداروں اور مالی اور پھر بہشتو تک کو گالیاں دیتا رہا۔اور جب مریاں نے بہشتو کو گالی دینے پر اعتراض کیا تو اس نے مریاں کو بھی گالی دے دی اور غصے میں بھرا ہوا باہر آ گیا۔اور باہر رئیس خانے کے صحن میں ڈاک بنگلے والا صاحب کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"سلام۔"فضلو کا ہاتھ ایک دم ماتھے کی طرف اٹھ گیا اس کے تنے ہوئے اعصاب میں اچانک سکون آ گیا اور اپنے چہرے پر برسوں کی انکساری لاتے ہوئے وہ صاحب کے پاس جا کر بولا۔"کیا حکم ہے حضور؟"

صاحب کی کنپٹیوں پر دو چار بال سفید ہو چلے تھے مگر چہرے کی رنگت میں سرخی غالب تھی۔آنکھوں میں بھیگی بھیگی چمک تھی اور ماتھے کے پیچھے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ایسا لگتا تھا جیسے جوانی صاحب کے روپ میں پختہ ہو گئی ہے۔پک چکی ہے اور جیسے ابھی اس کے مساموں سے خون کے ننھے ننھے قطروں کی صورت میں سنے لگے گی۔اس نے سگریٹ کو انگلی پر چڑھا کر فضلو کی کوٹھری کی طرف اس تیزی سے اچھالا کہ وہ کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی مریاں اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور صاحب نے نہایت نرمی سے پوچھا۔"تمہارا ہی نام فضل دین ہے۔"

"جی۔"وہ صاحب کو گونجتی آواز سے متاثر اور مرعوب ہو کر بولا۔"مجھے ہی فضلو چوکیدار کہتے ہیں حضور۔"

"فضل دین یا فضلو چوکیدار؟" صاحب مسکرایا۔

"جی بس فضلو چوکیدار۔"وہ عاجزی سے بولا۔

"کنوارے؟"فضلو بڑے ادب سے ہنسا۔"کنوارا کیسے ہو سکتا ہوں حضور، میرا تو ایک بیٹا بھی ہے چار برس کا۔"

"اور بیوی؟"

"جی ہاں بیوی بھی ہے۔"

"اور ماں باپ، بہن بھائی؟"

"وہ سب لدھ ہو چکے حضور۔"

"افسوس ہے۔"

فضلو نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

صاحب کچھ دیر تک رئیس خانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر پہلو میں لٹکتے ہوئے بیگ میں سے دور بین نکالی اور دور سون کی وادی کی طرف دیکھنے لگا۔ دور بین کے زاویئے کو بدلتے ہوئے جب صحن کے حاشئے کے درختوں سے ادھر فضلو کی کوٹھری کی طرف مڑا تو اچانک تیورا سا گیا۔ پھر دور بین کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے ہنس کر بولا ''لاحول ولاقوۃ، ایسا لگا جیسے تمہارا کوارٹر میرے اوپر چڑھ دوڑا ہے۔

اور کوارٹر کی کھڑکی میں مریاں اور شیرو فریم میں سجی ہوئی تصویر کی طرح کھڑے تھے اور صاحب کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا دھواں نیلی لہراتی دھاری بن کر ان کے چہروں پر سے گزر رہا تھا۔

''فضلو۔''

''جی۔''

''اگر ہم ڈاک بنگلے سے یہاں تمہارے رئیس خانے میں اٹھ آئیں تو کیسا رہے گا؟ فضلو کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی سانس اندر رہ گئی۔ اسے صاحب بھی اپنے سمیت سر کے بل کھڑا نظر آیا۔ رئیس خانہ بھی پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ بڑی مشکل سے اس کے حواس ٹھکانے پر آئے اور وہ بولا۔ ''میرے ایسے نصیب کہاں۔''

''واہ'' صاحب بولا، یہ بھی کوئی بات ہے اور مجھے تو یہ عمارت ڈاک بنگلے سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ میں آج ہی یہاں اٹھ آتا ہوں۔ اندر کچھ سامان ہے؟''

''جی سامان؟'' وہ صابن دانی کی چوری کا راز صاحب کو بتا کر اسے رئیس خانے سے بدظن نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں کوئی پلنگ؟''

''جی ہیں دو۔''

''اور میز؟''

''جی ہے اور کرسیاں بھی ہیں۔ ایک گلدان بھی ہے، ایک لالٹین ہے، غسل خانے کی بالٹی بھی ہے اور۔۔۔۔۔''

''صاحب مسکرایا اور نیا سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو میں ابھی آیا؟''

کچھ دیر تک فضلو وہیں کھڑا رہا، جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس کر رہ گئے ہیں۔ پھر وہ دوڑ کر رئیس خانے کے برآمدے میں آ گیا۔ مگر وہاں سے الٹے پاؤں کوٹھری کی طرف بھاگا کھڑکی میں سے آدھا لٹک گیا اور پکارا۔ ''مریاں۔'' پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر اندر لپکا، مریاں دروازہ روکے کھڑی تھی۔ وہ سنجیدہ تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے جڑے ہوئے تھے۔ ''تم اندر نہیں جا سکتے۔'' وہ بڑے تحکمانہ انداز میں بولی۔

''اندر نہیں جا سکتا؟'' فضلو نے ہانپتے ہوئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں؟''

وہ اسی لہجے میں بولی۔ ''پہلے تمہاری گالی کا جواب دوں گی۔''

''گالی کا جواب دوں گی؟''فضلو صاحب کا مژدہ سنانے کے لئے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔

''ہاں۔'' مریاں بولی۔ ''تم نے مجھے گالی کیوں دی تھی؟''

ٹالتے ہوئے بولا۔ ''بس دے دی کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟'' مریاں نے فضلو کا ہاتھ جکڑ لیا۔ ''یعنی کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے آج تک کسی کو گالی نہیں سہی۔ سنا؟''۔۔۔۔اور وہ ایک وقفے کے بعد بولی۔ ''سنا حرامزادے؟''

فضلو دم بخود رہ گیا۔ اور پھر ایک دم زور زور سے ہنستا ہوا ان مریاں سے لپٹ گیا۔ اسے اٹھا کر اندر کھاٹ پر پھینک دیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو مجھے اونٹ کی بچی معلوم ہوئی ہے۔ ایسا بلا کا کینہ ہے تجھ میں۔''

''تو ہو گا اونٹ کا بچہ۔'' مریاں نے جواب دیا مگر نا گواری سے نہیں۔ اب وہ مسکرا رہی تھی ور تہمد کے الٹے ہوئے پلو سے اپنی پنڈلی ڈھانک رہی تھی۔ پھر وہ دونوں اور زور سے ہنسنے لگے اور قہقہوں کے درمیان فضلو یوں اچانک اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بھڑ نے کاٹ لیا ہے۔ ''مریاں۔ سنو۔ صاحب رئیس خانے میں آ رہا ہے۔''

مریاں کے قہقہے رک گئے۔

''صاحب ہمارے ہاں آ رہا ہے۔ سنتی ہو؟''

مریاں حواس باختی سی نظر آ رہی تھی چند لمحوں کے بعد بولی۔ ''سچ؟''

''ہاں، ہاں،۔ اللہ کی قسم، وہ اپنا سامان لینے گیا ہے۔''

''مریاں اداس ہو گئی۔ ''پر فضلو، وہ حرامزادے شکاری چھو کرے ہماری صابن دانی تک اٹھا کر لے گئے۔ یہاں ادھر ہی کیا ہے۔ الو بول رہے ہیں دونوں کمروں میں، یہ صاحب رئیس خانے میں ادھر آئے گا ادھر بھاگ نکلے گا۔ میں تو کہتی ہوں اب یہاں جن بھی بسنے لگے ہیں اس روز عمارت کو غسل خانے میں بالٹی بج رہی تھی۔''

لیکن فضلو نے اس وقت مریاں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ چند روز ہوئے اس نے بالٹی میں سے ایک مری ہوئی چوہیا نکال کر باہر پھینکی تھی۔ اس نے مریاں کو سمجھایا کہ صاحب کو بس ایک پلنگ چاہئے اور بس۔۔۔۔ پھر وہ رئیس خانے کا سارا سامان ڈھو کر برآمدے میں لے گئے۔ کمرے جھاڑے، پلنگ رکھے، کپڑے ٹانگنے والی کیلوں پر سے مکڑی کے جالے اتارے اور گلدان دھویا جا چکا تو مریاں ڈاک بنگلے کے مالی سے بہن بہشتو کے ہاں سے تازہ پھول مانگنے چلی۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ مالی اور انجینئروں کے بنگلے کا چوکیدار سامان اٹھائے آ رہے ہیں۔ کچھ فاصلے پر صاحب بھی سگریٹ پیتا آ رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں نیچے پگڈنڈی پر ہی تھیں۔ اور مریاں اس کے قریب سے گزری تو جب بھی اس نے اوپر نہ دیکھا۔ پھر جب مریاں بہشتو سے پھول لے کر آئی تو وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور فضلو صحن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ مریاں نے کوٹھری میں جا کر کھڑکی میں سے فضلو کو پکارا اور پھول اس کے حوالے کئے فضلو نے اندر رئیس خانے میں جا کر انہیں گلدان میں سجایا۔ باہر آیا اور گلدان صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ صاحب چونکا۔

''کون لایا ہے یہ پھول؟''

''فضلو بولا۔''جی بیوی لائی ہے۔''

''ڈاک بنگلے کے معلوم ہوتے ہیں۔''

''جی ہیں تو ڈاک بنگلے کے، وہیں سے مانگ لائی ہے۔''

''پھر وہی منحوس ڈاک بنگلے کے پھول۔ صاحب نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔'' آج تو خیر مریاں پھول لے آئی ہے۔ لیکن کل سے پھول نہیں پتے سجا دیا کرو۔ یہی رئیس خانے کے درختوں سے پتے۔ سمجھے؟''

فضلو حیران ہو رہا تھا کہ آخر صاحب کو اس کی بیوی کا نام کیسے معلوم ہوا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بولا۔'' تمہاری بیوی کا نام مجھے مالی کی بہن نے بتایا تھا ابھی ابھی مریاں ہی ہے نا؟''

''جی مریاں ہی ہے۔''فضلو نے اطمینان سے جواب دیا۔

''مریم ہوگا۔''تم لوگوں نے مریاں بنالیا۔''

''مریاں ہی تھا صاحب۔''

صاحب کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کتاب کو ٹھپ سے بند کر کے بولا۔''میری مرحومہ بیوی کا نام مریم تھا؟''

فضلو کو خاموش اور متاسف پا کر بولا۔''بجلی کا پنکھا بند کر رہی تھی کہ کسی تار وار کو ہاتھ چھو گیا اور وہیں ختم ہوگئی۔۔۔شکر ہے یہاں سکیسر پر ابھی بجلی نہیں آئی۔''

''جی شکر ہے۔''فضلو نے کچھ سمجھے بغیر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور صاحب پھر سے کتاب کھول کر ورق الٹنے لگا۔

چار روز تک پلاؤ اور مرغے پکاتے پکاتے مریاں کی بری حالت ہوگئی۔ جب دیکھو، چولھے کے سامنے بیٹھی ہے چولے کی آستین شانوں تک چڑھا رکھی ہیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔

بال بکھر رہے ہیں اور ان پر راکھ کے ذرے جم رہے ہیں۔ ہاتھ سنے ہوئے ہیں۔ شیرو رہا ہے فضلو بو کھلا رہا ہے۔ لیکن جب رات کو سب کاموں سے فرصت پا کر وہ کھاٹوں پر آتے تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے اور دلوں میں سکون ہوتا۔ شیرے کو دو دن بدہضمی کی شکایت رہی لیکن اب وہ مرغن غذا کا عادی ہو گیا تھا۔ صاحب نے ایک نرم اور گرم مفلر بھی دیا تھا جسے رات کو بھی گلے میں لپیٹے رکھتا اور جب وہ گہری نیند سو جاتا تو فضلو دھیرے سے اس کا مفلر کھینچتے ہوئے کہتا۔''ہمیں بھی چھو لینے دے سور کے بچے۔'' دونوں خوب ہنستے۔ صاحب کی ذرا ذرا سی حرکتوں کو بڑے احترام سے یاد کرتے۔ مریاں بارش کی دعائیں مانگتی۔ کیونکہ صاحب بارش کے لئے بہت اداس تھا ہر وقت آسمان کی طرف دیکھتا اور جب نیچے وادی میں بادل گرجتے اور نمی سے لدے ہوئے جھونکے رئیس خانے کے درختوں سے لپٹتے ہوئے آتے اور اس کی کتاب کے ورق الٹ دیتے، گلدان میں سجے ہوئے پتوں کو ادھر ادھر بکھیر دیتے اور اس کے بالوں کو ماتھے پر گرا دیتے تو بڑے دکھ سے کہتا۔''فضلو۔۔۔بھئی یہاں آس پاس کوئی پیر وپیر ہو تو اس سے بارش کا تعویذ لکھوا لاؤ۔ یہ بھی آخر کیا ساون ہوا کہ سون کی ندیوں کی

گونج رات کو یہاں سنائی دے جاتی ہے اور سکیسر لٹے ہوئے رنڈوے کی طرح بے بس کھڑا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ بادلوں کی ساری فوجیں یہیں سے گزرتی ہے۔ پچھلے سال تو پھوار کسی وقت رکنے ہی میں نہیں آتی تھی مگر وہ ساون بڑا بے لطف کٹا۔ ڈاک بنگلے میں مینہ کیا مزا! چھت پر بوندوں کے گرنے کی آواز نہیں۔ کھڑکیوں پر لحافوں جیسے پردے لٹک رہے ہیں۔ ڈاک بنگلے میں رہنا یا کسی غار میں پڑا رہنا برابر ہے۔۔۔۔ بھئی فضلو، تم تو عرصے سے یہاں ہو۔ اب کے ساون یہاں کب آئے گا؟"۔۔۔۔ اور وہ دوربین لگا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگتا۔

وہ فضلو سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ اسے اپنے گھر کی ساری باتیں بتا دی تھیں۔ اس کی مرحومہ بیوی کا نام مریم اور اس کا نام یوسف تھا۔ مریم مر چکی تھی، شادی کو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ مریم کو بجلی کھا گئی اور وہ خود گھبرا کر خواہ مخواہ لمبے لمبے سفر کرنے لگا۔ مریم ساون میں مری تھی۔ اس وقت اس کی کوٹھی کی چھت پر بوندیں گا رہی تھیں اور روشندانوں کے شیشوں میں سے بجلی کے فوارے اندر لپک لپک کر مریم کی نیند سے بھری آنکھوں کو چندھیا جاتے تھے۔ دیر سے بجلی کا پنکھا چل رہا تھا مگر ساون کی جھڑی نے خنکی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے یوسف نے مریم سے پنکھا بند کرنے کو کہا اور یوں اپنی نئی نئی بستی ہوئی دنیا اجاڑ بیٹھا۔ وہ رات بھر مریم کی لاش سے چمٹا رہا۔ اور جب دوسرے دن رشتہ دار میت کو قبرستان لے جانے لگے تو وہ نینی تال چلا گیا۔ وہاں سے رنگون پہنچا۔ رنگون سے مدراس اور بمبئی کا چکر لگا تا وہ کراچی اور پھر کوئٹہ آیا۔ اور چند روز وہاں کے جلے ہوئے پہاڑوں میں گھوم کر وہاں سے اپنے وطن۔۔۔ حسن اور وقت کی اس سرزمین پنجاب میں وارد ہوا اور مری جانے کی بجائے سکیسر آ نکلا اور سکیسر کی ڈاک بنگلے کے باغیچے میں کھڑے ہو کر اس نے پہلے روز مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے دوربین لگائی تو کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اب کے بھی یہیں آ نکلا۔

"سکیسر پنجاب کا دل ہے۔" یوسف نے کہا۔

فضلو نے چار دنوں میں پہلی بار یوسف سے اختلاف کیا۔ "نہیں صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پنجاب کا دل تو لاہور ہے۔ اسے پنجاب کا دل نہ کہیے۔ یہاں پتھروں اور جھاڑ جھنکاڑ کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے۔ ایک وہ جھیل ہے سو بھادوں کی دوپہروں میں ایسی گندی باس اڑاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے دنوں کا گدھا پڑا سڑ رہا ہے۔ اور پھر یہاں کے لوگ توبہ کیجئے۔ حضور کسی سے ذرا سی ان بن ہوئی تو یہ نہیں کہ گھونسے طمانچے سے غصہ نکال لیا۔ بات بات پر برچھے پسلیوں کو کاٹتے ہوئے نکل رہے ہیں اور تبر کلہاڑیاں گردن کی نسیں کاٹتی ہوئی جا رہی ہیں۔ توبہ کیجئے صاحب۔"

لیکن صاحب کو اصرار تھا کہ پنجاب کا کوئی اور حصہ پنجاب کا دل کہلانے کا حقدار نہیں۔

دوسرے روز یہی بحث چھیڑتے ہوئے اس نے فضلو سے کہا۔ "سکیسر خوش گوار ہوا اور وادی کے منظر کو تو رکھ دو ایک طرف، مجھے یہ بتاؤ فضلو کہ یہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کا پنجاب بھر میں کہیں جواب مل سکے گا؟ گھوم آؤ پنڈی، ملتان، اور میانوالی سے دلی تک، مجال ہے جو تمہیں ایسی کافر آنکھیں، ایسی گھنی اور لمبی پلکیں، ایسے قد آور ایسے جسم، ایسا رنگ اور ایسی چال مل جائے۔ میرے خیال میں یونان کے بادشاہ سکندر نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو اسی وادی میں اس کی فوج کا کوئی دستہ ہمیشہ کیلئے رک گیا۔ ورنہ یہاں سو میں پچانوے چہروں کا

کٹ یونانی دیوتاؤں کا سا کیوں ہے؟''میں تو جسے بھی دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہومر پڑھ رہا ہوں۔عورتیں ہیں سو وینس ہیں۔مرد ہیں سواپالو ہیں۔ایسے تیکھے نقش تو انگرڈ برگین کو بھی نصیب نہیں ہوئے۔ایسی پامال کر دینے والی خوبصورتی تو ویلنٹینو کو بھی نہیں ملی تھی۔''

فضلو اس وقت کچھ ایسے منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے اس کا جبڑا پیدائشی کھلا ہے اور اب تک جڑنے نہیں پایا۔اس کی پتلیوں تک میں کوئی حرکت نہیں تھی اور وہ یوسف کے ہونٹوں پر نظریں جمائے بت بنا بیٹھا تھا۔یوسف کے خاموش ہونے کے کافی دیر بعد تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔پھر جب یوسف نے اسے پکارا تو وہ جیسے نیند سے چونکا۔''جی۔''اس کے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔''جی۔''وہ بولا۔''جی ہاں۔''آپ سچ کہہ رہے ہیں خوبصورتی تو یہاں بلا کی ہے۔ایسی ایسی بیٹی پیدا کی ہے یہاں کی ماں نے سبحان اللہ۔آپ نے ٹھیک کہا،اگر آپ خوبصورتی کو لیتے ہیں تو سچ مچ یہی پنجاب کا دل۔''

یوسف نے سگریٹ جلایا،بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دیر تک تابنے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔یوسف بھاگ کر باہر صحن میں آ گیا۔پھر فوراً اندر لپکا اور ایک دم بادل جیسے پھٹ پڑا۔صحن میں تھوڑی سی دھول اڑی اور بیٹھ گئی۔پرنالوں کے دھانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آ گرے اور آن کی آن میں سکیسر پر جوانی آ گئی۔یوسف ابھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمیٹنے نہیں پایا تھا کہ فضلو کی کوٹھری کی کھڑکی میں سے مریاں چلائی۔

''اے فضلو!اے لپک کے آ۔سب کچھ گیا چولہے کے پاس۔''

فضلو تہمد کو گھٹنوں تک اٹھا کر باہر بھاگنے کو تھا کہ یوسف نے کہا۔''یہ مریاں تھی شاید۔''

''جی مریاں ہی تھی۔''اس نے جواب دیا۔

''آج پہلی بار اس کی آواز سنی ہے۔شاید پردہ کرتی ہے۔''یوسف یونہی رواداری میں بولا۔

فضلو نے تہمد کو پھر گھٹنوں تک اٹھاتے ہوئے کہا۔''جی پردہ تو نہیں کرتی۔بس ذرا کھڑکی سے آواز آئی۔''کان کتے تو نہیں لے گئے۔''

فضلو نے گھبرا کر یوسف کی طرف دیکھا۔''گالیاں بکنے لگی سور کی بچی۔''

''جاؤ جاؤ بھاگو۔''یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔''کہیں مجھ پر ہی نہ برس پڑے۔''

اور فضلو جو صحن میں پہنچ چکا تھا۔۔۔۔موسلا دھار بارش سے بے پرواہ ہو کر رک گیا اور پلٹ کر بولا''مجال ہے اس کی،زبان کاٹ کر انگاروں پر نہ رکھ دوں۔''اور لپک کر کوٹھری میں گھس گیا۔

پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو صاحب کرسی پر بیٹھا ٹانگیں میز پر رکھے نیچے لٹکے ہوئے ہاتھ میں بیکار جلتا ہوا سگریٹ پکڑے گنگنا رہا تھا۔

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

اس روز کوٹھری سے رئیس خانے تک کھانا لانے میں صاحب کی برساتی نے بڑا کام دیا۔فضلو اور مریاں اسے اپنے سروں پر تان لیتے اور پھر دونوں طشت تھامے ہولے ہولے رئیس خانے میں آتے، مریاں برآمدے میں رک جاتی، فضلو طشت اندر لے جاتا، باہر آ کر وہ پھر سے برساتی کو سروں پر تان کر کوٹھری سے کھانے کی دوسری قسط لینے جاتے ایک بار جب مریاں برآمدے کے ایک ستون کا سہارا لئے برساتی پر سے پانی جھٹک رہی تھی تو اندر سے آواز آئی۔''باہر کون ہے؟''

''مریاں ہے صاحب''، فضلو بولا۔

''باہر کھڑی کیا کر رہی ہے؟''یوسف کی آواز آئی۔''ٹھنڈ ہو رہی ہے اس سے کہو اندر آ جائے یا کوٹھری میں چلی جائے۔''

''جی کوٹھری میں چلی جائے گی۔''فضلو نے کہا۔

لمحے بھر کے وقفے کے بعد یوسف بولا۔''اچھا کھانا پکاتی ہے تمہاری بیوی۔''

فضلو نے فوراً کہا۔''جی وہ کیا پکاتی ہے گھی کے کھیل ہیں سارے۔''

اور مریاں باہر ہی سے بولی۔''تیرے باپ کے کھیل ہیں۔''اس کی آواز بلند ہو گئی۔

''ذرا کسی روز صبح سے شام تک چولہے کے پاس بیٹھو تو ، نانی یاد آ جائے حرامزادے کو۔''

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور وہ بھیگتی ہوئی کوٹھری کی طرف چلی۔

یوسف کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ لال ہو گیا اس نے حواس باختہ فضلو سے قہقہوں کے درمیان پوچھا۔''مزاج کیسے ہیں تمہارے؟''

''فضلو دانت پیستا ہوا زیر لب بولا۔''سور کی بچی۔''

یوسف کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔کچھ دیر کے بعد فضلو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور بولا۔''کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا حضور!''

''تمہارے غصہ تو ٹھنڈا ہو لے۔''وہ بولا۔''کھانا تو پیٹ میں جا کر گرم ہو جائے گا۔گھبراتے کیوں ہو فضلو تمہیں اینٹ کا جواب اینٹ ہی سے ملا پتھر سے نہیں ملا۔''

فضلو کا غصہ شاید ابھی نہیں اترا تھا۔''اس سور کی بچی سے تو یہ بھی دور نہیں حضور کہ سچ مچ پتھر اٹھا کر دے مارتی۔گھروں میں ہر میاں بیوی کی کبھی کبھی ٹھن ہی جاتی ہے۔پر حضور کے سامنے بک دینے کی عادت ،بہت بری ہے۔''

''لیکن حضور کو تو لطف آ گیا۔''یوسف نے کہا اور فضلو کی ندامت کسی حد تک دور ہو گئی۔

مینہ کچھ دیر کے لئے تھم کر پھر برسنے لگا، اور پھوار میں بدل گیا، یوسف نے دونوں طرف کی کھڑکیاں کھول دیں اور چھت، درخت کے پتوں اور پتھروں اور چٹانوں پر پھوار کی گنگناہٹیں سننے لگا۔فضلو سونے سے پہلے یوسف سے حسب معمول''کوئی اور کام''پوچھنے آیا تو یوسف نے کہا۔''ہاں ایک کام ہے تو سہی۔''فضلو ہاتھ باندھے انتظار میں کھڑا رہا۔

یوسف سگریٹ جلا کر تین چار کش لگانے کے بعد بولا۔ ''ادھر آؤ۔''

فضلو چند قدم آگے بڑھا۔

''اور آگے آؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ پلنگ پر۔'' یوسف نے بستر کے ایک حصے کو تھپک کر کہا۔

''پلنگ پر حضور؟'' فضلو دم بخود رہ گیا۔ ''پلنگ پر کیسے صاحب؟'' یوسف نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا کر بولا۔ ''ایسے۔'' فضلو کچھ ایسے انداز سے بیٹھا جیسے وہ نرم نرم گدے کے بجائے تپتے توے پر بیٹھا ہے۔ ''حضور۔'' اس نے حیرت سے کہا اور یوسف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

یوسف آج کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا آدھا حصہ روشن تھا۔ فضلو کو گمان سا ہوا کہ اس کی آنکھ بھیگ رہی ہے اور گال پر پانی کا ایک قطرہ چمک رہا ہے۔ باہر پھوار کی مسلسل گنگناہٹ سے فضا پراسرار ہو رہی تھی۔ پھوار نے فضا میں خنکی کے علاوہ کا جل بھی گھول دیا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے دور کسی بنگلے کے روشن دان ذرا سے روشن تھے۔ میز پر رکھے ہوئے گلدان میں درختوں کے پتے بے ترتیب ہو رہے تھے۔ لالٹین کی زبان ہر تیز جھونکے کے تھ چلو بھر دھواں اوپر اچھال دیتی تھی۔ قسم قسم کے پتنگوں کے ہجوم نے لالٹین کی شیشی پر ہلہ بول رکھا تھا۔ ان پتنگوں میں ایک بھڑ بھی تھی جس کے پروں کی بھنبھناہٹ دوسرے پتنگوں پر چھائی ہوئی تھی۔ فضلو نے ایک بار پھر یوسف کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ اب گال پر چمکتا ہوا قطرہ ٹھوڑی کی طرف بہہ آیا تھا اور آنکھ کے گوشے میں ایک نیا قطرہ ڈھلک جانے کو تیار کھڑا تھا۔

کیا دیکھ رہے ہو فضلو؟'' یوسف نے پوچھا۔

فضلو نے جھجکتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے اس کی گال کر طرف اشارہ کرتے ہوئے بس اتنا کہہ سکا۔ ''یہ حضور، یہ۔۔۔'' اور اس نے انگلی کو مٹھی میں شامل کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔

''یہ آنسو ہیں۔'' یوسف فضلو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''آنسو بہانا میری عادت ہے، اسی لئے تو مجھے ساون کا انتظار تھا۔ مریم انہی دنوں مجھ سے چھٹی تھی نا، اسی لئے ساون کی راتیں میں نے ہمیشہ روتے روتے گزاری ہیں۔ رونا بزدلی نہیں۔ ایک آنسو بہانے کے لئے اتنا بہت سا لہو جلانا پڑتا ہے۔ اور میں رات بھر روتا ہوں۔ میں بہت دکھی ہوں، فضلو میرے پاس روپیہ ہے، جاگیریں، زمینیں ہیں، کوٹھیاں ہیں لیکن میں کتنا غریب ہوں، مریم کے بغیر میں کتنا غریب ہوں۔'' اس نے ایک طرف سے رومال اٹھا کر آنکھیں پونچھیں اور فضلو کے پاس کھسک کر بولا۔ ''میں تو ایسا لٹا ہوں فضلو کہ اب کبھی آباد نہیں ہو سکوں گا۔''

''کیوں نہیں آباد گے حضور ضرور ہوں گے۔'' فضلو نے کچھ بولنا اپنا فرض سمجھا۔

''مگر کیسے؟'' یوسف نے پوچھا۔

فضلو خاموش رہا، وہ صرف تسلی دینا چاہتا تھا۔ اس کے پاس آبادی کو کوئی تجویز نہ تھی۔

ویسے فضلو۔۔'' یوسف نے بڑے راز بھرے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میری مدد کرو تو اس ٹھنٹھ میں کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں۔''

''میں حضور؟'' فضلو پر حیرتوں کی تہیں جم رہی تھیں۔

''ہاں تم۔۔۔تم اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کیوں سمجھتے ہو۔فضلو تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔دنیا کا کوئی انسان معمولی نہیں اور تم چاہو تو میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہو۔۔۔کر سکو گے؟''

''کروں گا حضور'' اس نے کہا۔''کر سکا تو ضرور کروں گا، پر میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔''

''پھر وہی بات! دیکھو فضلو، بات یہ ہے کہ میں یہاں رئیس خانے میں اکیلے پڑا راتیں گزار رہا ہوں تو سچ کہتا ہوں اکیلے رہنا کوئی نعمت نہیں مجبوری ہے اور۔''

''تو حضور'' فضلو کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔''میں سو جایا کروں آپ کے کمرے میں۔''

''نہیں بھئی۔'' یوسف ذرا سا مسکرایا۔''تم مجھے آباد کرنے کے لئے اپنی مریاں کو برباد کر دو گے، ایسی بات نہیں، بس تم مجھے یہ بتا کہ۔۔۔خیر، رہنے دو۔تم برا مان جاؤ گے۔''

''برا کیوں ماننے لگا صاحب، آپ حکم تو دیجئے۔''

''بات یہ ہے کہ میری مدد کر سکتے ہو، لیکن اس کے لئے تمہیں بہت دلیر بننا پڑے گا، دیکھو کیا اس سکیسر پر ۔۔۔یا نیچے اس وادی میں۔۔۔'' وہ خاموش ہو گیا، اٹھا اور کھڑکی بند کر کے اور لالٹین کو ذرا سا دھیما کر کے پھر فضلو کے پاس آ بیٹھا۔فضلو ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔

اور پھر یوسف تیزی سے بولنے لگا۔''دیکھو فضلو دوست کیا اس سکیسر پہاڑ پر کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں ہو گی جو میری راتیں آباد کر سکے۔کوئی ایسی لڑکی نہیں ہو گی جو مجھ سے ایک سو روپے لے کر رات بھر میری زندگی کی جلی شاخ پر پھول بن کر کے مہکے اور صبح کو چلی جائے۔کیا خدا کے ایک دکھی بندے کی دنیا کی چند گھڑیوں کو آباد کر کے تمہارا دل خوش نہیں ہو گا؟ فضلو تم گھبرا کیوں رہے ہو؟ تم تو ہانپ اور کانپ رہے ہو۔میں تمہیں ہر رات کے دس روپے دوں گا۔میں مفت خور نہیں ہوں۔مجھ جوانی کا بھوت سوار ہوتا تو میں لاہور واپس جا کر ہیرا منڈی میں ڈیرے ڈال لیتا۔لیکن مجھے کاغذی پھول نہیں چاہئیں۔اسی لئے تو میں رنگون سے کوئٹے تک بھٹکتا پھرا۔مجھے سچ مچ کی ایک عورت چاہئے۔سچ مچ کی ایک عورت۔۔۔۔''

یوسف ایک لمحے کے لئے رکا۔فضلو یوں کانپ رہا تھا جیسے کوئی بہت اونچا پہاڑ طے کر کے آ رہا ہے۔یوسف کی خاموشی کے دوران میں اس کی سانسیں اور تیز ہو گئیں۔اس کے پپوٹے اوپر اٹھ گئے۔وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا۔نہیں صاحب میں غریب ہوں، کمینہ نہیں ہوں، مجھ سے ایسا نہیں ہو گا، میں ایسا کام کبھی نہیں کیا۔''

''فضلو'' یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس کی آواز بچوں کی طرح بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہہ نکلیں۔''نہیں فضلو، تم میرے لئے ضرور ایسا کرو گے، میرا دل اتنی مدت سے ویران پڑا ہے، تم چاہو تو اسے آباد کر سکتے ہو اور یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ایک پیاسے کتے پر ترس کھا کر اسے پانی پلا دینے سے لوگ جنت میں جگہ پاتے ہیں تو ایک انسان کی بھوکی روح کو سیراب کرنے سے کتنا ثواب ملے گا۔اس کا اندازہ۔۔۔۔''

فضلو اپنا ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گیا اور کہیں رکے بغیر دروازے میں سے نکلتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب، میں کسان کا بیٹا ہوں، کنجر نہیں ہوں۔"

فضلو نہایت غصے میں برآمدہ طے کر کے اپنی کوٹھری کے دروازے تک آیا تو اندر مٹی کے چراغ کی جناتی روشنی دیکھتے ہی اسے اپنی اور مریاں کی جھڑپ یاد آ گئی، کھانا کھانے کے دوران بھی وہ اس سے نہیں بولی تھی۔ پھر جب وہ صاحب سے رات کے لئے رخصت ہونے جا رہا تھا تو اس نے دھم سے کھاٹ پر گر کر چادر تان لی تھی اور پھر اب تک اس نے چراغ نہیں بجھایا تھا۔ فضلو دروازے پر یوں ٹھٹک گیا جیسے صاحب نے اسے ننگا کر دیا ہے۔ وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص کبھی اس سے عورتوں کی دلالی کی خدمت بھی لے گا اور خاص طور سے یہ صاحب۔

وہ اندر آ گیا، پگڑی اتاری اور چراغ بجھائے بغیر کھاٹ پر سیدھا لیٹ گیا اور بجھنگ چھت میں سے کہیں دور دیکھنے لگا۔ پھوار رک گئی تھی، ایک مینڈک کہیں قریب کے گڑھے میں ٹرا رہا تھا۔ چراغ کی لو کا دھواں برمے کی طرح چھت میں سیدھا گھسا جا رہا تھا۔ شیرو نیند میں بڑبڑایا، "اتنا تھوڑا سا پلاؤ دیا ہے ماں۔۔۔ اور بھی دو نا۔۔۔ وہ سی بوٹی دے دو نا۔۔۔"

فضلو نے سر اٹھا کر شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ پرانے کھیس میں کچھ ایسے سمٹا ہوا تھا جیسے اس سے زیادہ سمٹے گا تو پسلیاں توڑ بیٹھے گا۔ مریاں بھی گٹھری بنی پڑی تھی۔ خود اس کا بستر بھی یخ ہو رہا تھا۔ اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کہیں سے سردی کی ایک دھار اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی جھریوں میں سردیوں ہی میں اس نے گارا تھوپ دیا تھا تو پھر یہ سردی کھڑکی میں سے آ رہی ہوگی۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ اسے بھیڑنے لگا تو اسے رئیس خانے کی کھڑکی نظر آ گئی، پہلے تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے گہرے پیلے رنگ کی ایک چادر رئیس خانے کی دیوار میں جڑ دی گئی ہے۔ مگر پھر اسے چادر کے نچلے حاشئے پر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی۔ تو یہ صاحب کا سر تھا۔۔۔ تو وہ ابھی ابھی تک اسی طرح بیٹھا تھا؟۔۔۔ بیٹھا رہے۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ دیکھا رہے عورتوں کے خواب، اس نے کھڑکی کا پٹ دھک سے بند کر دیا۔ مریاں نے چونک کر چادر میں سے سر نکالا اور ایک لمحے کے بعد پھر چادر میں چھپ گئی۔

"جاگ رہی ہو؟" فضلو نے پوچھا۔ مگر وہ خاموش رہی اور کہیں اندر سے وہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہے سب خاموش رہیں اور اس سناٹے میں وہ اپنے دماغ میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کو بجھانے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہوا سو جائے۔۔۔ وہ پھر سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔

"چراغ بجھا دو۔ چادر کے اندر سے مریاں کی آواز آئی۔

"بجھا دوں گا۔" اس نے گواری سے کہا۔ "جاگ رہی ہو؟"

مریاں خاموش رہی۔

فضلو نے مریاں کو ایک زناٹے کی گالی دینا چاہی۔ مگر اس سے سناٹے کے مجروح ہو جانے کا احتمال تھا جو اس وقت فضلو کے لئے ہوا کی طرح ضروری تھا۔

دیر تک اسے اپنے آپ سے شرم آتی رہی۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ رو دے۔ آنسو اس کی پتلیوں کے پیچھے مچل رہے تھے، اور گلے میں کچھ اٹک سا گیا تھا اور سارا خون اور دماغ میں جمع ہو رہا تھا۔ پھر اچانک کھولتے ہوئے خون میں کوئی چیز جھنجھنائی اور فضلو نے تیزی سے کروٹ بدل لی ایک اور جھنکار ہوئی اور وہ تڑپ کر دوسری کروٹ پر آ گیا۔ یہ جھنکاریں اور چھناکے اب کے اس کی رگوں میں دوڑنے لگے اس کے ٹخنے تک بج رہے تھے۔ اس کے کانوں کی لویں تک تپ رہی تھیں۔ وہ اٹھ بیٹھا، چراغ بجھا دیا اور پھر دیر تک وہیں کھڑا بجھے ہوئے چراغ کی لو کا بدبودار دھواں پیتا رہا۔ دروازے کھول کر باہر جھانکا کوئی بھیگا ہوا پرندہ چولہے کے پاس آ گرا پھر اڑا اور دیوار پر کھلو نے طرح جا بیٹھا، وہ شاید سو گیا تھا۔

ساری دنیا سو گئی تھی۔ صرف صاحب جاگ رہا تھا یا فضلو۔۔۔ صاحب کی جیب میں روپے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ فضلو کی جیب خالی تھی اور آنکھوں میں جلن تھی اور اندر شیر و کو اوڑھا دیا۔ چراغ بجھایا اور پھر کھاٹ پر آ رہا۔

دیر تک اس نے سو جانے کی کوشش کی آیت الکرسی تین بار کے بجائے سو بار پڑھ ڈالی اپنے بالوں کی ایک لٹ کو اتنی دیر تک مروڑتا رہا کہ بالوں کی جڑیں دکھنے لگیں۔ ٹھوڑی کے ایک طرف ننھے سے مہاسے کو اتنی دیر تک کھرچا کہ وہ زخم بن گیا۔ اٹھ بیٹھا اور دیوار کا سہار لے لیا۔ پھر جب پیٹھ دکھنے لگی تو کھاٹ پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ پسلیوں کا چھویوں چھبنے لگیں تو پھر اٹھ بیٹھا۔ اور دماغ میں دھماکے کے ساتھ چھناکا ہوا۔۔۔ دس روپے روز۔۔۔ بیس دنوں میں دو سو روپے۔۔۔ دس مہینوں کی تنخواہ۔۔۔ اور پھر سب سو رہے ہیں۔ سب سو جاتے ہیں اور اسے روپیہ چاہئے عورتوں کو بھی روپیہ چاہئے۔۔۔ ماؤں باپوں کو روپیہ چاہئے۔۔۔ مولوی حلیم نے دو لڑکیوں کو خراب کیا، پکڑا یا قید ہوا چھوٹ کر آیا، لعنت ملامت ہوئی اور پھر دینا بھول گئی اور وہ پھر سے مسجد کا امام ہو گیا۔ دنیا بھول جاتی ہے۔ دنیا سو جاتی ہے۔ چوکیدار تک سو جاتے ہیں۔ اور اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ لوگوں کو عورت تو کیا ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور بہشتو کے کانوں میں سونے کے کانٹے ہیں اور سر پر آبی دوپٹہ ہے۔۔۔ اور مریاں کے کانوں کو لوؤں کے سوراخ اداس ہیں اور اتنے لمبے لمبے بالوں پر ایسے موٹے کھدر کی چادر ہے جو لوہے کی چادر پر گڑی جائے تو اسے بھی گھسا کر کاغذ بنا دے اور صاحب آدھی رات کو اسی طرح بیٹھا ہے وہ رو رہا ہے وہ مرد ہو کر عورت کی طرح رو رہا ہے۔ اس کی آواز میں للکار کی جگہ پکار ہے، وہ اتنا بڑا آدمی ہے، اتنا بڑا زمیندار ہے اور اتنا غریب ہے، اتنا محتاج ہے کہ ایک چوکیدار سے ایک عورت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس بھیک کی قیمت بھی ادا کرے گا۔

’’مریاں جاگ رہی ہو؟‘‘

’’کیا ہے؟‘‘ غصے سے بھری ہوئی مریاں کی آواز آئی۔

’’ارے! تم جاگ رہی ہو؟‘‘ وہ یوں گھبرا کر بولا جیسے مریاں سے سامنے اچانک ننگا ہو گیا ہے۔

وہ دیر تک چت لیٹا رہا۔ اس کی سانسیں تک بے آواز تھیں۔ اسے اپنا باپ یاد آ گیا۔ جس کے ہاتھ میں ہل، ستی اور ایک تسبیح ہوتی تھی۔ اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس روز اس کی کوئی نماز قضا ہوئی اسی روز قیامت آئے گی اور وہ جیل میں مرا کیونکہ مہاجن نے قرضے کی واپسی سے نا امید ہو کر نالش کر دی اور وہ بخار کی حالت میں اندر بھیج دیا گیا اور مر گیا۔۔۔ فضلو کی انگلیوں کو پوروں میں چل سی

ہونے لگی۔ جیسے سرسریاں جلد کے اندر گھس کر پوروں کے دائرے میں گھوم رہی ہیں۔۔۔۔روپیہ ہے تو عزت ہے، نیک نامی ہے، صحت ہے روپیہ نہیں تو اجڑے ہوئے رئیس خانے کی چوکیداری ہے۔ اور مریاں کی گالیاں ہیں اور شیرو کی کراہیں ہیں۔ روپیہ نہ ہو تو آدمی خدا تک کی راہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مسجد میں تیل تک نہیں دے سکتا۔ جمعرات کو مولوی کے لئے ایک روٹی تک نہیں پکوا سکتا۔ سر جھکا کے چلتا ہے۔ ہاتھ جوڑتا ہے، منت کرتا ہے۔ منہ میں بھر آنے والا پانی تھوکتا ہے۔۔۔۔ اور پھر یہاں حوریں تو نہیں بستیں عورتیں بستی ہیں اور یہ عورتیں وہ پریاں نہیں کہ چھولو تو طوطے بن جائیں۔ بھشو ہی کو لو۔ اس کی آنکھوں میں وہ باؤلا پن ہے جیسے ذرا سا اشارہ کردو تو بھاگ کر آئے گی اور گود میں بیٹھ جائے گی۔ مریاں جیسی عورتیں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔ یہاں جو پردہ نہیں کرتیں مگر پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ کوئی دیکھ لے تو خود ہی پانی پانی ہو جائے۔ اور وہ سرائے کے بھٹیارے کی رانی خوبصورت ایسی ہے کہ لٹھے کے تھان کی مورت اور ندیدی ایسی کہ اٹھنی دکھاؤ تو بھوکی کتیا کی طرح بھاگی آئے اور پھر یہ مسافر عورتیں جو سروں پر پوٹلیاں رکھے سڑک پر سے گزرتی ہیں۔ اور یہ کنواریاں جن کی مدت تک شادیاں نہیں ہوسکتیں مارے غریبی کے اور یہ بیاہی عورتیں جن کے شوہر ہانگ کانگ پولیس میں ہیں اور پانچ سال کے بعد تین مہینے کے لئے گاؤں کا چکر لگا پاتے ہیں۔ جب کہ ان بیویوں گاؤں کی بوڑھی دایا کو چار بار انعام دے چکی ہوتی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ، آدمی ایسا بزدل بھی نہ ہو کہ عورت کا نام سنا اور گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ ایک دم اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا، رئیس خانے کی کھڑکی اسی طرح روشن تھی اور صاحب کمرے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔ فضلو نے کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر دروازہ کھولا اور تیزی سے صحن کو طے کرکے برآمدے میں آ گیا۔ دروازے پر جاتے ہی لوہے کی لاٹھ کی طرح جم گیا۔ زندگی کے سارے آثار، اس کے وجود سے غائب ہوگئے، اور اگر فوراً یوسف کی آواز سے نہ چونکاتی تو شاید وہ قیامت تک یونہی کھڑا رہا رہتا۔

''رک کیوں گئے فضلو؟'' یوسف بولا۔

اور فضلو کے پاؤں تلے جیسے ایک سپرنگ نے اسے اچھال کر اندر پھینک دیا۔

''بیٹھو'' یوسف نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فضلو نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر چھت پر ایک نظر یوں دوڑائی جیسے وہاں بھی کوئی دروازہ کھلا ہے۔ پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے رک رک کر بولا۔ ''جی میں کروں گا۔۔۔ کل سے کروں گا۔''

اور اس کے بعد جیسے اسپرنگ نے اسے اچھال کر پھر سے دروازے پر پھینک دیا۔ مگر یوسف نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے فضلو کی انگلیوں کی پوروں سے چھواتے ہوئے بولا۔ ''تم اتنے شریف، اتنے نیک اور اتنے اچھے آدمی ہو کہ میں تمہاری جھجک پر حیران ہو رہا تھا۔ یہ تمہارے وعدے کا انعام ہے۔''

فضلو کی پوروں کی چل اب دکھن میں بدل گئی۔ اس نے نوٹ کو پوروں میں جکڑ لیا۔ اور اسی ہاتھ کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے ''سلام'' کہا اور چلا گیا۔ کوٹھری کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لالٹین بجھ گئی تھی اور رئیس خانہ اس کی کوٹھری کی طرح

اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ فضلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کئی دنوں کے بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا ہے۔ وہ اندر کھاٹ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑا رہا، پھر نوٹ کو جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھا اور نہایت اطمینان سے سو گیا۔

صبح وہ دیر تک سوتا رہا۔ مریاں نے چائے تیار کرنے کے بعد اس کا شانہ ہلایا اور وہ بھڑک کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سامنے مریاں کو دیکھا، پھر باہر ننھی ننھی پھوار کی جھالر کے پارٹیشن کی چھت تلے چولہے کے پاس شیرو کو بیٹھے دیکھا جو مٹی کے پیالے میں چائے کو پھونکیں مار رہا تھا اور پھر اس نے آسمان کے ایک ٹکڑے کو دیکھا۔ ''ابھی تو سورج بھی نہیں ابھرا'' اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''سورج نہیں ابھرا!'' مریاں کی طنز کی۔ رات کا غصہ شاید! ابھی تک باقی تھا۔ ''سورج بادلوں بادلوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کے لئے ابھی پو بھی نہیں پھٹی۔ رات بھر کیا کرتے رہے ہو؟ چوہوں بلیوں کی طرح کبھی لحاف گھسیٹ رہے ہو کبھی کھڑکی کے پٹ کھڑکا رہے ہو کبھی دروازہ کھل رہا ہے، کبھی باہر کی سیریں ہو رہی ہیں۔۔۔۔ بہت تو نہیں کھا گئے تھے؟''

فضلو کی نظریں اس وقت بند کھڑکی پر جمی تھیں۔ اسے آہستہ آہستہ یاد آ رہا تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر ریئس خانے کی طرف دیکھا تھا اور پھر کھڑکی بند کئے بغیر باہر چلا گیا تھا۔

''یہ کھڑکی کس نے بند کی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں نے۔'' مریاں بولی۔

''کب؟'' اس نے پوچھنا چاہا مگر نہ پوچھ سکا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ کوٹھری کے صاف ستھرے فرش میں اسے جا بجا گڑھے نظر آنے لگے۔ مریاں سے اسے خوف آنے لگا۔ ''مریاں۔'' اس نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ تمہارے روٹھ جانے کی وجہ سے میں رات بھر اداس رہا، نیند نہیں آتی تھی۔''

''حرامزادہ۔'' مریاں نے کہا۔ مگر اس انداز سے کہ فضلو نے اس گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔ ''میں روٹھی تھی تو بھی تو روٹھے تھے۔ تم نہیں سوئے تو میری کب آنکھ لگی ذرا ادھر دیکھو۔''

تو وہ رات بھر جاگتی رہی ہے!۔۔۔ تو اس کو سب کچھ معلوم ہے!

''ادھر دیکھو۔'' مریاں نے دوبارہ کہا۔

اس نے مریاں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوج رہی تھیں اور تھکی ہوئی تھیں لیکن ان میں غم یا غصہ نہیں، پیار کی روشنی تھی۔ ''آؤ من جائیں۔'' وہ بولی۔ ''دایاں ہاتھ ادھر لاؤ۔''

فضلو اطمینان سے مسکرایا، دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مریاں چیخ اٹھی۔ ارے یہ تو دس روپے کا نوٹ ہے! یہ اتنے بہت سے روپے کہاں سے لائے ہو؟۔۔ تنخواہ تو ابھی پرسوں ہی ملی تھی۔''

''صاحب نے بخشیش دی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ہماری خدمت سے بہت خوش ہے۔''

بخشیش!'' مریاں جیسے نشے میں بولی۔ ''جیتا رہے، پھلے پھولے، خوشیاں دیکھے۔۔۔ اور فضلو آج بڑا غضب ہو گیا۔ صاحب کے

لئے مکھن کہیں سے نہیں ملا۔ سب کہتے ہیں رات اچانک سردی پڑی اس لئے دہی نہیں، جمابلو نے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بڑی شرم آ رہی ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمارا صاحب قلندر آدمی ہے۔ اور سور کی بچی صلح بھی ہو چکی اور ابھی ایک پیار تک کی توفیق نہیں ہوئی تجھے۔ کچھ شرم ہو تو ڈوب مرو چائے کی کیتلی میں۔''

مریاں ہنس دی۔ اس نے بھی فضلو کی گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہیں سمجھا۔ وہ جھکی، اس کے گال کو چوما اور پھر اپنا گال آگے کر دیا۔ فضلو نے پہلے تو اسے ہلکا سا طمانچا مارا، پھر جب وہ سنجیدہ سی بن کر پلٹنے لگی تو فضلو نے اسے جکڑ لیا اور اتنے پیار کئے کہ باہر شیرو چائے پینا تک بھول گیا۔

چائے کا طشت لے کر وہ رئیس خانے کو چلا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے سنبھلا، اور اندر کچھ یوں جھینپا جھینپا گیا جیسے اپنے چہرے سے رات کی کالکھ دھونا بھول گیا ہے لیکن یوسف نے رات کی کوئی بات نہ کی، خوشگوار موسم کا ذکر کیا اور اس سے کہا۔ ''ذرا یہ دوربین لے کر سکیسر اور سون کے نظارے دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی بڑی بڑی لینڈ سکیپ پینٹنگز بکھر دی گئی ہیں ہر طرف۔۔۔ یعنی بڑے اچھے نظارے ہیں۔'' فضلو دوربین لے کر باہر صحن میں آ گیا۔ نیچے وادی میں جھیل کے کنارے درختوں کے عکس دیکھتا رہا۔ پھر چٹا اور کوٹلی اور گالی کے دیہات پر سے ہوتا ہوا انگہ پہنچا جہاں سفید سفید دو منزلہ مکان آسمان کے ابر آلود ہونے کے باوجود چمک رہے تھے۔ لمبائی میں بکھرے ہوئے سبززاروں میں جا بجا گھنے توتوں میں گھرے ہوئے کنوؤں اور ان کے گرد ترشی ہوئی کیاریوں کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ وہاں سے سون کے مرکزی قصبے نوشہرہ کی طرف گھوما، شہر سے زیادہ ہسپتال اور سکول کی عمارتوں پر جا کر رکا۔ پھر تھانے پر آیا، کالی، بھجنگ عمارت ایک پرانے قبرستان کے سرے پر شاید پرانی قبروں میں ہی اپنی بنیادیں گاڑے کھڑی تھی، پھر وہ سبھر ال کفری اور کروڈھی پر سے ہوتا ہوا اچھالی پہنچا، یہ گاؤں جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر آباد تھا۔ گاؤں کے اردگرد کنوؤں کے پاس توتوں کے چھتناروں تلے بہت سے خیمے تنے ہوئے تھے۔ ان خیموں میں ایسے میدانی رئیس بستے تھے جو سکیسر کی بلندیوں پر آنا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ سکیسر پر مرغی کا ایک انڈا چار آنے میں اور گلاب کا ایک پھول آٹھ آنے میں ملتا تھا اور ڈاک بنگلے کے مالی کی غیر حاضری میں تو اس کی بہن بہشتو نے کئی لوگوں سے ایک پھول کا ایک روپیہ تک وصول کیا تھا۔

فضلو فوراً پلٹا اور دوربین کو سکیسر کے بنگلوں پر گھمایا، صحن سے ڈاک بنگلہ نہایت صاف نظر آتا تھا مگر دوربین کی وجہ سے وہ ابھی ڈاک بنگلے تک نہیں پہنچنے پایا تھا۔ درخت نہا کر نکھر گئے تھے۔ ننھی ننھی پھوار نے پتوں پر موتی ٹانک دیئے تھے۔ اور رئیس خانے کے درختوں کے پتے تو فضلو کو صاحب کے بٹوے کے برابر نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک دم گھومتی ہوئی دوربین ڈاک بنگلے پر جا کر رک گئی۔ باغیچے میں بہشتو پھول توڑ رہی تھی۔ وہ اسے اتنی قریب محسوس ہوئی کہ اس کا جی چاہا، اس سے بات کر لے۔۔۔ اس کا لباس علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا۔ مگر پھوار کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے اس کے جسم سے چمٹ گیا تھا اور بھری بھری آپے سے باہر جوانی کے بڑے کافر دائرے اور ظالم قوسیں نمایاں تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، شاید وہ کچھ گنگنا رہی تھی اور ایک درخت پر بیٹھے ہوئے لال چونچوں

والے سبز طوطے گردنیں یوں جھکائے بیٹھے تھے جیسے بہشتو کو دیکھ رہے ہیں اور دیکھ نہیں رہے تو سن ضرور رہے ہیں۔

''بھئی تم تو دوربین کے ہی ہو رہے۔'' اندر سے آواز آئی اور وہ چونکا، چائے کے برتن واپس پہنچا کر اور خود جلدی جلدی چائے پی کر وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ روزانہ اس وقت باہر جانا اس کا معمول تھا۔ مرغیاں خریدتا تھا، انہیں ٹٹولتا تھا، انہیں ہاتھ پر تولتا تھا، ان کے دام چکاتا تھا اور پھر انہیں لا کر اور ذبح کر کے ان کی چمڑی ادھیڑتا تھا۔ لیکن آج وہ کچھ اور خریدنے نکلا تھا۔ زندگی میں یہ اس کا پہلا تجربہ نہ سہی، لیکن پہلا عملی تجربہ ضرور تھا۔

شادی سے پہلے اس نے جی ہی جی میں گاؤں کی ہر خوش رو لڑکی سے عشق کیا، چوراہوں پر بیٹھا، الغوزے بجائے ہیر گائی لیکن اس نے آج تک کسی لڑکی کا پلو نہیں کھینچا تھا۔ کسی کے کنکری نہیں ماری تھی۔ کسی کے قریب سے گزرتے ہوئے آہ نہیں بھری تھی۔ بس سب کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا۔ اور بہت دنوں تک سب کے لئے ترس ترس کر جیا تھا۔ اور پھر اسے مریاں مل گئی جسے دیکھ کر وہ ساری دنیا کا حسن بھول گیا تھا ، اسے تیلی کی اس لڑکی تک کا حسن بھول گیا تھا جس کے بارے میں سوچتے سوچتے اس نے خوابوں میں اس کے کولہو چلائے تھے اور نمبردار کے گھر سے سرسوں اور تارا میرا کی بوریاں چوری چوری اس کے ہاں ڈھولایا تھا۔ مریاں سب سے مختلف تھی بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر کاجل کی دھندلی سی لکیر آج پانچ چھ سال سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دھلی تھی۔ اس کے چہرے کی لالی اور گالوں کی شفق کو سوکھے ٹکڑے تک نہیں چھین سکے تھے۔ اور اس کے بالوں کی لہریں لکڑی کی بے رحم کنگھیوں میں سینکڑوں بار کسے جانے کے باوجود نہیں مٹنے پائی تھیں۔ مریاں کے بارے میں اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر وہ بات بات پر گالی نہ بکتی تو اس کی ٹکر کی عورت کسی نواب کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ وہ پانچ چھ برس تک مریاں سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا اور آج وہ بہشتو کے پاس جا رہا تھا۔۔۔ اور اگر بہشتو نے اپنے بھائی سے کہہ دیا۔۔۔ اس کے بھائی نے کسی افسر سے کہہ دیا۔۔۔ اور پھر کسی نے اگر مریاں سے کہہ دیا۔ تو؟ تو کیا! بہشتو اسے تو نہیں چاہیے تھی اور۔۔۔ لیکن سامنے کھڑی ہوئی بہشتو کی آواز نے اس کے ڈولتے ہوئے ارادے کو سنبھالا دیا۔ ''کہاں چلے فضلو بھائی۔۔ مرغیوں کی تلاش میں ہو گے۔ یہ صاحب سیکسر پر مرغیوں کی نسل ختم کر کے ہی دم لے گا''۔۔۔ وہ زور سے ہنسی، اس ہنسی میں گھنٹی کی سی ٹنٹناہٹ تھی۔

ایسی ہنسی جو صحت مند خون کے کھولاؤ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

''پھول چاہئیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''اے حیران کیوں کھڑے ہو؟'' ''میں نے کبھی تم سے قیمت لی ہے۔ جو آج لوں گی۔ مریاں اپنی سہیلی ہے۔''

ہیر پھیر سے بات کرنے کی ان گنت تجویزیں فضلو کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئیں۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ اچانک خشک ہو گئے، آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب ہو گئیں اور وہ پاگلوں کی طرح نہایت بھولے طریقے سے بولا۔ ''بہشتو۔''

''کہو۔''

''صاحب کے پاس رات گزارو گی؟'' ''سو روپے ملیں گے۔'' اور وہ خیال ہی خیال میں زمین کے اندر دھنسنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ

آیا کہ وہ سکیسر کی چوٹی پر کھڑا ہے یا جھیل کے تہہ میں بیٹھا ہے۔ اور آسمان سے پھوار گر رہی ہے یا کنکریاں برس رہی ہیں۔

بہشتو نے اس کے ہاتھ کو اس تیزی سے جکڑا کہ انگلیوں کی ٹیس نے اس کے حواس کو چوکنا کر دیا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''کس وقت؟''

ارے!

فضلو جھیل کی تہہ سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کے باغیچے میں آ گیا۔

''عشاء کی نماز کے بعد۔'' وہ بولا۔

''کہاں ملو گے؟''

''سڑک سے ادھر پرانے کھو کے نیچے۔''

''سو ہی ملیں گے نا؟''

''ہاں ہاں پورے سو۔''

''بھیا کو خبر نہ ہو۔''

''مجھے کیا پڑی ہے۔''

''آہستہ بولو۔''

''بھئی ذرا آہستہ بولو۔''

کچھ دیر رک کر وہ مسکرائی اور بولی۔ ''صاحب آج پانچ چھ دن سے تمہارے وہاں ہے۔''

''ہاں۔''

''مریاں نے کتنے سو کمائے ہیں؟''

ایک دم جیسے آسمان ٹوٹ پڑا اور سکیسر بیٹھ گیا۔ ''سور کی بچی۔'' اس نے بہشتو کو گالی دی اور مٹھیاں بھینچ کر اور نچلے ہونٹ کا ایک حصہ دانتوں تلے دبا کر بھاگا۔

''فضلو بھائی۔'' بہشتو کی آواز آئی۔

مگر وہ بھاگا چلا گیا۔ رئیس خانے کے قریب گزرتے ہوئے اس کی رفتار اور تیز ہو گئی اور پھر بہت نیچے سڑک کے بڑے موڑ پر چھٹے ہوئے بادلوں میں اتر گیا۔ وہ کافی دیر کے بعد واپس آیا۔ نہایت گنجان بوندیں گر رہی تھیں اور ہوا نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی تھی۔ نیچے وادی کا ایک حصہ دھوپ کی وجہ سے سنہری ہو رہا تھا۔ مگر سورج کا کہیں نشان نہ تھا۔ فضلو ٹھٹھرا اور بھیگا ہوا کوٹھری میں آیا۔ صاحب کو کھانا کھلانے کے بعد پھر کوٹھری میں آ گھسا اور کھاٹ پر لیٹ رہا۔ مریاں وقت سے پہلے اس کے لئے چائے بنا لائی۔ ''آج کچھ سست سے لگ رہے ہو۔ موسم ایک دم بدلا ہے نا۔۔۔۔ چادر اوڑھ کر باہر جایا کرو۔ سکیسر کا ساون تو سون کے اسوج کے برابر ہوتا ہے۔ لو چائے

پیو۔اٹھو۔"

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا، پھر چادر اوڑھ کر صاحب کو چائے پلانے گیا اور واپس آکر کھاٹ پر پڑا رہا۔صاحب کو کھانا کھلانے گیا اور پھر آکر کھاٹ پر گر پڑا۔اس نے صاحب سے کوئی بات نہ کی اور صاحب نے بھی اس کی سنجیدگی کو نہ توڑا جیسے اسے معلوم تھا کہ اس سنجیدگی کی تہہ میں کچھ ہے۔سکیسر کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ کر جب نمازی باتیں کرتے ہوئے رئیس خانے کے قریب سڑک پر سے گزرے تو فضلو چونکا مگر پھر چادر سے منہ تک چھپالیا۔اندر اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور کھدر کی چادر میں سے اسے چراغ کی روشنی بہت ڈراونی معلوم ہورہی تھی۔مریاں اور شیرو آج اطمینان سے سو رہے تھے۔مریاں نے دیر تک اس کا سر دبایا تھا اور پھر اس کی کھاٹ پر سے یوں دبے پاؤں اتری تھی جیسے وہ سو گیا ہے مریاں پر اسے بہت پیار آنے لگا۔پھر اچانک اس کے جی میں آئی وہ کوٹھری سے نکل کر سیدھا ڈاک بنگلے میں پہنچے اور وہاں باغیچے میں کھڑے ہوکر بہشتو کو ایسی ایسی گالیاں دے جو آج تک کسی نے نہ سنیں نہ سوچیں۔وہ چادر لپیٹے چپکے سے باہر آگیا۔

رئیس خانے کی کھڑکی روشن تھی، روشنی سے کترا کر سڑک کی طرف جانے لگا کہ پرانے کہو کے تنے کے پاس کچھ ہلا اور آواز آئی۔"فضلو بھائی۔"

وہ گڑ گیا۔اس کے دماغ میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔گالیاں اس کے دماغ میں نکل کر اس کے گلے میں ایک دوسرے پر سوار ہوکر بیٹھ گئیں اور اس کی زبان کی نوک تپ گئی۔

بہشتو اس کے قریب آگئی۔"میں تو بھیگ گئی فضلو، اتنی دیر سے تو بیٹھی ہوں، نماز تو کب کی ہو چکی۔"

فضلو وہیں جما رہا۔

"فضلو مجھے بخش دو، مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ذرا سے مذاق پر تمہیں اتنا تاؤ آجائے گا میں تو صرف مذاق کر رہی تھی اور۔۔۔"

فضلو نے اس کا ٹھنڈا اور بھیگا ہوا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ رئیس خانے کی طرف چلا۔

برآمدے میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے پلٹ کر کوٹھری کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ایک جھری نظر آرہی تھی۔وہ چراغ بجھانا بھول گیا تھا اور یہ جھری جیسے اس پر ہنس رہی تھی، پھر وہ ایک چھڑی بن گئی۔پھر سمٹ کر مریاں کی غصے اور دکھ سے بھری ہوئی آنکھ بن گئی اور جب فضلو نے اپنی آنکھیں ملیں تو وہ پھر سے جھری بن گئی۔اس نے بہشتو کو ہاتھ سے گھسیٹ کر تیزی سے اندر جانا چاہا۔مگر بہشتو اپنا ہاتھ کھینچ کر آہستہ سے بولی۔"پورے سو ہی ملیں گے نا؟"

"پورے سو۔" فضلو پہلی بار بولا اور اسے اندر لے گیا۔

یوسف گھٹنوں کے ارد گرد باہیں لپیٹے، سر کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔آواز سن کر چونکا اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں تک میں پھیل گئی۔وہ تیزی سے اٹھا ،کھڑکی بند کر دی۔فضلو کو باہر برآمدے میں لے گیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا۔"تم بہت اچھے آدمی ہو فضلو۔میں جیسے جی تو تمہارے احسان کا بدلہ شاید ہی اتار سکوں، یہ لو ایک سو کا نوٹ یہ بہشتو کے لئے اور دس

روپے۔۔۔یہ تمہارے ہیں۔۔۔۔۔کل نیا حساب چلے گا۔۔۔۔۔میں برا آدمی نہیں ہوں فضلو۔۔۔۔۔یہ دنیا بری ہے۔یہ ساون برا ہے۔۔۔سمجھے؟۔۔۔خدا حافظ۔''

فضلو کی پوروں میں صبح والی چل جاگ اٹھی، اس نے دونوں نوٹ اپنی مٹھی میں چھپائے اور اپنی کوٹھری میں آ گیا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا دیا بجھانے کے باوجود اسے نیند نہ آئی مریاں کی سانسوں تک کی آواز سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔شیرو کے کھٹولے کی ایک ذراسی آواز سے وہ لرز اٹھتا تھا۔اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔زبان جڑ تک خشک ہو گئی۔سانس تک مشکل سے انے لگی۔ ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا، صبح قریب تھی۔وہ رئیس خانے کی طرف لپکا، اندر لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ساتھ والے کمرے میں گیا۔وہاں ٹین کا ایک دیا جل رہا تھا اور بہشتو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔فضلو کے اندر جاتے ہی وہ بھڑک اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بولی۔''یہ کیسا صاحب ہے فضلو۔یہ تو کچھ انوکھا صاحب ہے۔میں نے تو یہ رات کانٹوں پر گزار دی ہے ایسا لگتا تھا جیسے ہاتھ پیر کاٹ کر گھوڑے پر ڈال دی گئی ہوں۔سو روپے کا سودا، اور ہوا یہ کہ تمہارے جانے کے بعد اس نے بڑے پیار سے میرے لئے یہ بستر بنایا پھر مجھے یہاں بیٹھ جانے کو کہا۔لالٹین وہ سامنے رکھ دی اور مجھے پاگلوں کی طرح ٹکر ٹکر بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔میں گھبرا کر رخ بدلنا چاہا تو بولا۔''نہیں تو نہی بیٹھی رہو۔میں تمہیں دیکھوں گا۔میں صرف دیکھوں گا تمہیں۔تمہیں نیند آنے لگے تو سو جانا۔میں تمہیں سوتا دیکھوں گا۔تم رونا چاہو تو رو دینا۔میں تمہاری بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھوں گا۔بس میں صرف دیکھوں گا تمہیں۔اور فضلو وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا میں تھک کر لیٹ گئی جب بھی وہ مجھے دیکھتا رہا، میری ذرا سی آنکھ لگ گئی۔پھر جب کھلی تو وہ اسی طرح میری طرف دیکھ رہا تھا۔اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔بس میں آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔اور وہ سامنے بیٹھا رہا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔پھر جب پہلے مرغے کی بانگ سنائی دی تو لالٹین اٹھا کر ادھر کمرے میں چلا گیا۔اور جب سے نہیں سو پائی، جانتی تھی کہ ابھی صبح ہو جائے گی۔میرا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے گھٹنوں تلے دبا کر خوب پیٹا ہے اور اس نے مجھے چھوا تک نہیں فضلو۔''

فضلو کی حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔صاحب اس کی نظروں میں اچانک ان ولیوں کی صورت اختیار کر گیا جو لڑکوں اور لڑکیوں سے محبت کر کے خدا کی محبت تک پہنچے، گاؤں کا مولوی حلیم بھی اسے بالکل بے گناہ نظر آنے لگا۔ممکن ہے وہ بھی خدا تک پہنچنے کی کوئی سبیل ڈھونڈ رہا ہو۔۔۔اور یہ صاحب۔۔۔!

اس نے ایک سو کا نوٹ بہشتو کے زانو پر رکھ دیا۔

''سو کا ہے نا؟''اس نے دیئے کی طرف جھک کر نوٹ کو الٹا پلٹا۔

''پورے سو کا ہے۔''وہ بولا۔''جاؤ پو پھٹنے ہی والی ہے۔''

''تمہارا حصہ؟''بہشتو نے شاید تجربے کی بنا پر پوچھا۔

''جاؤ''، فضلو گھبرا کر بولا۔

بہشتو اٹھی اور کراہی۔ پھر ایک لمبی انگڑائی لی۔ اٹھتے ہوئے ہاتھ تیزی سے نیچے گرائے اور رانوں پر چٹاخ سے ارے الٹے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اس نے دوپٹہ یوں احتیاط سے لپیٹا جیسے تہجد پڑھنے چلی ہے، وہ بولی۔ ''تم کل والی بات سے خفا تو نہیں؟''

فضلو نے نفی میں سر ہلا دینا کافی سمجھا۔

''میں تو نوکر ہوں تمہاری، جب چاہو بلا لینا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ صاحب بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ بہشتو نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو صرف بہشتو کو دیکھا اور عورت کو دیکھتا کون نہیں۔ خود فضلو نے بہشتو کو کئی بار دیکھا تھا۔

دیکھنے میں کیا برائی ہے۔۔۔ وہ کوٹھری میں واپس آکر بڑی گہری نیند سو گیا۔

صبح سے مریاں نے جگایا۔۔۔ ''یہ دیر تک سونے کی کیا عادت ڈال رہے ہو؟''۔۔۔ چوکیدار کو یہ زیب نہیں دیتا۔'' اس نے بڑے پیار سے فضلو کو سمجھایا۔

پھر جب وہ صاحب سے پاس چائے لے گیا تو وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر بہت رونق تھی اور اگرچہ آنکھیں تھکی تھکی تھیں مگر اس تھکن میں بھی ایک کیفیت تھی۔ فضلو نے اسے نہایت عقیدت سے دیکھا۔ دونوں مسکرائے اور صاحب بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے۔ آج دھوپ نکلے گی، بادل بھاگے پھر رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔'' فضلو نے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا، مارے عقیدت کے اس کا گلا بھر آرہا تھا۔

چائے پی کر پھر کسی نئی عورت کی تلاش میں نکل گیا۔ اور نہایت آسانی سے سرائے کے بھٹیارے کی بیوی سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی شخصیت ایسی زوردار تھی کہ بڑی بڑی حسین عورتوں کے مجمعے میں بھی سب پر چھائی رہتی تھی۔ اور اس کے ہونٹوں میں پکے پھولوں کی سی دعوت تھی۔۔ فضلو نے دن بھر اطمینان سے دوسرے کام کیے، رات کو وہ پرانے کھوتلے آنکلی، اسے رئیس خانے تک پہنچایا، کوٹھری میں آکر سو رہا۔ ٹھیک وقت پر آنکھ کھلی، دبے پاؤں رئیس خانے تک پہنچا، لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں دیا روشن تھا اور جوان بھٹیارن پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ فضلو کو دیکھتے ہی رونے لگی۔

''کیا بات ہے؟'' فضلو نے تسلی دینے کا ارادہ کیا۔

''بات تو کوئی نہیں فضلو'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اور دکھ کی بات بھی یہی ہے۔ کہ کوئی بات ہے ہی نہیں۔ صاحب نے رات بھر مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا، بس بیٹھا دیکھتا رہا دیر تک کہنے لگا۔ بس میں تمہیں دیکھوں گا۔ میں نے صرف دیکھتے رہنے کے لئے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ سونا چاہو تو سو جاؤ، مجھے تو بس دیکھنا ہے۔۔۔''

''تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' فضلو نے پوچھا۔

وہ اور زور سے روتے ہوئے بولی روپے جو نہیں ملیں گے۔ صرف دیکھنے کے کون دیتا ہے سو روپے۔''

فضلو نے سو روپے کا نوٹ بھٹیارن کو تھما دیا۔ وہ پہلے تو منہ کھولے سو روپے کے نوٹ کو دیکھتی رہی پھر آنسو پونچھے اور چپکے سے باہر چلی گی۔

فضلو دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے دیا بجھایا اور یوسف کے کمرے میں آیا وہ سو رہا تھا۔ فضلو کو اسکے چہرے کے ارد گرد ایک ہالا نظر آنے لگا۔ اس کے ماتھے میں سے لالٹین کی سی روشنی نکل رہی تھی۔ ''کتنا اچھا ہے میرا صاحب۔۔۔ کتنا پیارا ہے۔۔۔ کتنا نیک ہے۔۔۔۔ اللہ یہ ساون کبھی ختم نہ ہو۔۔۔۔ اللہ یہ جھڑی کبھی نہ رکے۔۔۔۔ اللہ صاحب کبھی یہاں سے نہ جائے۔۔۔۔'' وہ چپ چاپ باہر آ گیا۔

آج وہ نئی عورت کے لئے باہر سڑک پر آیا ہی تھا کہ ایک دم بادل چھٹ پڑا اور سڑک پر جاتی ہوئی عورت گھبرا کر پرانے کھوتلے آ گئی۔ وہ کوٹھری کی طرف بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر اس عورت کو دیکھ کر اس نے قسمت آزمائی کی ٹھانی، پتلی دبلی سی تھی مگر ناک نقشہ ایسا کہ معلوم ہوتا تھا چینی کی گڑیا میں جان پڑ گئی ہے۔

وہ اس کے پاس گیا۔ ''کہاں جانا ہے بہن؟''

''میانوالی جانا ہے۔'' وہ پوٹلی کو دامن تلے چھپاتے ہوئے بولی۔ ''وہاں میرا گھر والا جیل میں ہے۔ ملاقات پر جا رہی ہوں۔''

''آج رات یہیں رک جاؤ۔'' فضلو نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''کیا؟'' عورت نے حیرت سے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں۔ رات کی تو بات ہے۔ یہیں میرے پاس رہ جاؤ۔ ایک صاحب آیا ہوا ہے۔ رات کے سو روپے دیتا ہے۔''

عورت تن کر کھڑی ہو گئی۔ پوٹلی نیچے گرا کر ایک طرف کھل گئی اور اس میں سے دیہاتی بسکٹ، گوگڑے، جھانکنے لگے۔ اس نے چلا چلا کر فضلو کو اتنی بہت سی گالیاں دیں کہ وہ وہاں سے گھبرا کر بھاگا۔ ''اپنی ماں کو لے آ۔۔۔ اپنی بہن کو بلا لا۔۔۔۔ اپنی بیوی سے کہہ۔۔۔'' دور تک اسکی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ سڑک پر سے بڑی پگڈنڈی اور بڑی پگڈنڈی پر سے چھوٹی پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا عورت کی آواز اور بادل کی گرج اور موسلا دھار بارش اس کے تعاقب میں ہیں۔ اس کا لباس اس کے جسم سے چپک گیا۔ مارے ٹھنڈ کے دانت بجنے لگے۔ ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور وہ بھاگتا چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر مسافر عورت کی آواز کو مریاں نے سن لیا۔ اور مریاں نے سے بھاگتا دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔

آخر وہ ایک بنگلے کے پہلو والی کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس طرف بھاگا۔ اندر ایک نوجوان عورت بیٹھی مٹھی بھر دال کو چنگیر میں پھیلائے اس میں سے کنکریاں چن رہی تھی۔ فضلو کو دیکھتے ہی بولی۔ ''پھنس گئے بارش میں؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا اور چولے اور چادر کو نچوڑنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' عورت بولی۔

وہ بیٹھنے کی جگہ منتخب کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ادھر چولہے میں کچھ آگ ہوگی۔'' وہ بولی۔

فضلو چولہے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بارش اسی شدت سے ہو رہی تھی۔

لڑکی کا چہرہ عام سا تھا۔ مگر اسکے ہونٹوں کے گوشے بڑے پیارے تھے۔ بھرے بھرے گالوں میں پھنسے ہوئے اور گہرے۔ بات کرتی تھی تو اس کی ایک گال پر دو گڑھے بنتے اور مٹتے رہتے تھے وہ بولی۔ ''رئیس خانے کے چوکیدار ہو نا؟''

''ہاں۔'' اس نے حیرت سے کہا اور پھر سوچا۔ یہ تو بہت بری بات ہوئی یہ تو مجھے پہچانتی ہے۔

''یہاں کیا کرتی ہو؟'' فضلو نے پوچھا۔

''نوکرانی ہوں بیگموں کے جسم دباتی ہوں رات کو۔۔۔۔دس روپے اور روٹی۔۔۔۔کٹ رہی ہے۔''

''اکیلی؟''

ہاں، کوئی ہے ہی نہیں۔ سب ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔ ماں یہیں پچھلے جمعے کو مری ہے۔ کفن بیگم نے دیا تھا۔۔۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ دال میں سے کنکریاں چننے کے بجائے چہرے پر سے آنسو سمیٹنے لگی۔

فضلو کو یہ عورت بہشتو اور بھٹیارن سے کچھ الگ ہی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہنے کی جرات نہ سکا۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت کوسا کہ خواہ مخواہ مولوی بنا پھرتا رہا اور اسے آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ سکیسر پر وہ کون سی عورتیں ہیں جو آسانی سے خریدی جاسکتی ہیں۔ مسافر عورت کی گالیاں ابھی تک اس کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ وہ دیر تک لکڑی کے ایک ٹکڑے سے چولہے میں بجھے ہوئے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر جب کافی دیر کے بعد بارش تھمی تو وہ اٹھا۔

''جاتے ہو؟'' عورت نے پوچھا۔

باہر آتے ہی اس نے اپنے آپ کو بڑا بزدل محسوس کیا۔ اگر وہ یہاں سے کچھ کہے بغیر پلٹ گیا تو پھر اور کون ہے سکیسر بھر میں۔ کیا وہ مریاں سے جا کر کہے گا؟۔۔۔اس نے وحشت میں اپنے بالوں کی ایک لٹ یوں کھینچی جیسے جڑ سے اکھیڑ لے گا۔ تو کیا وہ یہاں سے ناکام پلٹ جائے گا۔ اور اس کے صاحب کی راتیں اجڑ جائیں گی اور اس کے روز کے دس روپے مہینے کے تین سو روپے الگ مارے جائیں گے۔۔۔وہ گھوم کر پھر دروازے پر آ گیا۔

''کچھ بھول گئے ہو؟'' عورت نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا؟''

''ایک بات کہنا بھول گیا۔''

''کیا بات؟''

''ایک بات ہے۔''

''کیا بات ہے؟''

''ذرا سی بات ہے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''سو روپے ملیں گے۔''

''سو روپے۔'' عورت نے حیران ہوکر کہا۔ ''مگر کس بات کے؟''

''بس ایک رات کی بات ہے۔'' فضلو نے بڑی جرات سے کہا۔

عورت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو بھر گئے اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو اکٹھے بہت سے آنسو ایک دوسرے کے پیچھے چنگیر میں گرنے لگے۔ اور وہ جیسے کنکریوں کے بجائے آنسو چننے لگی۔ پھر وہ چنگیر کو ایک طرف رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

فضلو شرمندہ ہوکر واپس چلا آیا۔ اس روز سکیسر کے بنگلوں کے چکر پر چکر لگاتا رہا۔ بہت سی نوکرانیاں، چوکیدارنیاں، سبزی بیچنے والیاں اور مسافر عورتیں اسے دکھائی دیں۔ مگر وہ کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ صاحب کے سامنے بھی نہ گیا۔ شیرو نے بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے برتن صاحب تک پہنچائے اور شام کو اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کسی نہ کسی عورت سے ضرور بات کرے گا۔ آخر ایسی بزدلی بھی کیا۔۔۔ وہ یہ فیصلہ کر کے سڑک پر آیا تو ایک طرف بنگلے والی نوکرانی دکھائی دی۔ وہ اس کے پاس آئی۔ وہ اسی طرح رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ اور ہونٹوں کے گوشوں میں تھرتھری تھی اس نے فضلو کی طرف دیکھے بغیر رکتے رکتے کہا۔ ''آؤں گی۔''

فضلو کا اچھلنے کو جی چاہا۔ سرگوشی میں بولا۔ ''تو پھر عشاء کی نماز کے بعد بیگموں کے جسم داب کر وہاں اس کھو کے تلے آ جانا۔ آ جاؤ گی نا؟''

''آؤں گی۔'' وہ بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرے جا رہے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ سچ مچ کھو تلے آ گئی۔ وہ اس وقت بھی رو رہی تھی اور جب وہ اسے صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر برآمدے میں آیا، اور پلٹ کر دیکھا تو وہ تب بھی رو رہی تھی۔

منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھلی، وہ رئیس خانے میں گیا، یوسف لالٹین جلائے سو رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں دیا جل رہا تھا اور وہ بستر پر مزے سے سو رہی تھی۔ فضلو مسکرایا۔ اس نے عورت کے پاؤں کا انگوٹھا آہستہ آہستہ ہلایا۔ وہ جاگ اٹھی۔ پہلے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک سکون بھری انگڑائی لی اور مسکرا کر بولی۔ ''میں ایسی ڈر رہی تھی، ایسی ڈر رہی تھی۔۔۔ خواہ مخواہ ڈرتی رہی۔ اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس دیکھتا رہا۔ اور دیکھنے میں کیا پڑا ہے۔''

مسکراتے ہوئے اس نے چادر اوڑھی، مسکراتے ہوئے اس نے سو کا نوٹ لیا۔ مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی اور فضلو کو محسوس ہوا جیسے اس نے تین سو روپے چولہے میں جھونک دیئے ہیں۔ تین سو روپے۔۔۔ پندرہ بیساں!۔۔ جن سے وادی میں ایک کچا گھروندہ بن سکتا ہے۔ اور اگر تین سو اور مل جائیں تو ہل اور بیل خریدے جا سکتے ہیں۔ یا دال گڑ کی ایک دکان کھل سکتی ہے۔۔۔ اور پھر وہ کچھ کہتا تو ہے نہیں کسی سے۔ بس دیکھتا ہے جانے کیا دیکھتا ہے اپنی مریم کی صورت دیکھتا ہے یا اللہ کی قدرت دیکھتا ہے، بس دیکھتا ہی ہے نا۔ کچھ چھین تو نہیں لیتا۔ کوئی خرابی تو نہیں کرتا۔

وہ دوسرے کمرے میں آ گیا، صاحب سو رہا تھا۔ وہ اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اپنی کوٹھری کی طرف آہستہ آہستہ آیا۔ اور جب دروازہ کھولا تو سامنے مریاں کھڑی تھی۔۔۔ وہ تیورا کر پیچھے ہٹا اسے بڑے زور کا چکر آ گیا۔ جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو کر کھولنے لگا۔

''کہاں گئے تھے؟'' مریاں نے تلخی سے پوچھا۔

''صاحب کے پاس۔'' اس کے دماغ میں قسم قسم کے بہانوں نے آفت مچا دی۔

''اس وقت کیوں گئے تھے؟ اس نے اسی تلخی سے پوچھا۔

''اس کے سر میں درد تھا۔'' ایک بہانہ اس کی زبان پر آ گیا۔

''کیا روز اسی وقت اس کے سر میں درد ہوتا ہے؟ مریاں نے سختی سے کہا۔ ''آج تین چار دوں سے جا رہے ہو۔''

فضلو نے دروازے کا سہارا لے لیا۔ اسے ایک اور بڑے زور کا چکر آ گیا تھا۔

گھبراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں کچھ ایسا ہی درد ہے۔ اس وقت ہوتا ہے۔''

''اور یہ رئیس خانے میں سے ابھی ابھی نکل کر کون گیا ہے؟'' مریاں کے لہجے میں چھریاں تھیں۔ ''کہو گے یہ صاحب کے سر کا درد تھا۔''

فضلو نے محسوس کیا جیسے اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر گر پڑے گا اور اس کا بھیجا تالو کو پھاڑ کر اوپر اڑ جائے گا لیکن اس نے ایک دم بڑے زور کا کھسیانا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''چلو تمہیں ساری بات بتا ہی دوں، تم سے کیا پردہ، بالکل ذرا سی بات ہے، کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ راستہ دو۔''

وہ اندر کھاٹ پر بیٹھ گیا، شیرو سو رہا تھا، چراغ کی لو بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ مریاں اپنی کھاٹ پر بیٹھنے لگی تو فضلو نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ ''ادھر میرے پاس بیٹھو، تین دن سے سور کی بچی نے ایک چمی تک نہیں دی۔''

''حرامزادے گالی بکتا ہے'' وہ بولی۔ ''اب بتا کیا بھید ہے راتوں کو اٹھ اٹھ کے جانے میں تم سمجھتے ہو میں سوتی رہتی ہوں۔ آج بھی تمہیں باہر جاتا دیکھا تو کہا لاؤ ذرا دیکھوں تو یہ جاتا کہاں ہے۔ اور جو دیکھا تو ایک عورت اندر سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی۔ شور مچا دیتی۔ پر تمہاری بدنامی کا ڈر تھا۔ صاحب نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟ کیا ہم کنجر ہیں؟۔۔۔ اور تمہارا کیا ہاتھ ہے اس میں؟''

''تم نہیں جانتیں۔'' وہ بولا۔ اندر سے باہر گھبرا رہا تھا۔ اس کی نسیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں ویران ہو رہی تھیں۔ اس کی کنپٹیوں کی رگیں صاف تڑپتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مگر جھوٹ موٹ کے اطمینان سے اس نے اپنی آواز ضرور سنبھالے رکھی۔ اس نے اپنا ایک بازو مریاں کی پیٹھ پر پھیلا کر اس کا شانہ پکڑ لیا اور بولا۔ ''یہ صاحب تو مجھے بڑا اللہ والا معلوم ہوتا ہے مریاں۔ یہ تو کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہے، سوچو ایک جوان عورت اس کے سامنے رات بھر بیٹھی رہتی ہے وہ جو چاہیئے اس سے سلوک کرے، پر وہ ہے کہ بیٹھا دیکھ رہا ہے عورت کو چھوتا تک نہیں۔ صرف دیکھ رہا ہے۔ اور صبح سے پہلے ایک سو روپیہ دے کر اسے چلتا کرتا ہے۔ سن رہی ہو؟۔۔۔ ایک سو روپیہ۔۔ پانچ بیساں۔۔ اور

صرف دیکھتا ہے۔‘‘

فضلو نے محسوس کیا کہ مریاں کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

’’سن رہی ہو مریاں؟‘‘ اس نے دوبارہ پوچھا۔

’’اور یہ عورتیں لاتا کون ہے؟‘‘ مریاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

فضلو نے ہیر پھیر کی کوشش کی۔’’ بھئی اس میں بری بات ہی کون سی ہے۔اب تم کتنی بار چشمے سے پانی لینے گئی ہو۔کتنوں نے تمہیں دیکھا ہے تو کیا میں سب کی آنکھیں نکال لوں؟

دیکھنے میں کیا رکھا ہے اور صاحب عورتوں کو صرف دیکھتا ہے۔۔۔‘‘ اس نے تیس روپے نکال کر مریاں کی گود میں رکھ دیئے۔

مریاں نے نوٹوں کو نفرت سے نیچے گراتے ہوئے کہا۔’’ پر لاتا کون ہے عورتیں؟‘‘

’’بھئی کوئی بھی لائے۔وہ کچھ کہتا تو ہے نہیں۔تکتا ہے اور سو روپے نکال دیتا ہے۔‘‘

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔’’ میں ہی لاتا ہوں۔‘‘

مریاں نے فضلو کا ہاتھ اپنے شانے پر سے جھٹک دیا اور ایک دم رونے لگی۔فضلو مریاں سے لپٹ گیا۔اس کی پیٹھ اور گردن اور بالوں کو چوما اور بولتا چلا گیا۔’’ مجھے خدا کی قسم مریاں۔۔قرآن کی قسم۔۔۔مریاں مجھے تمہاری قسم، آج تک تین عورتیں لایا ہوں اور تینوں پاک صاف واپس گئی ہیں۔ایک بہشتو ہے۔ایک سرائے والی بھٹیارن ہے۔ایک ادھر ایک دکھنی بنگلے کی نوکرانی ہے تینوں تین سو روپے لے گئیں اور وہ انہیں دیکھتا رہا، بس دیکھتا رہا سن رہی ہو؟ اس نے انہیں چھوا بھی ہو تو شیرو مرے، میں مروں، تم مرجاؤ۔‘‘

مریاں نے آنسو پونچھے اور بولی۔’’ پتہ ہے تو کس کا بیٹا ہے؟‘‘

فضلو ہنسا۔’’ تو کون کہتا ہے کہ میں اچھی بات کر رہا ہوں اور یہ بھی کون کہتا ہے کہ میں کوئی بری بات کر رہا ہوں۔‘‘

’’بری بات تو ہے ہی۔‘‘ مریاں نے کہا۔مگر اب اس کا لہجہ اتنا سخت نہ تھا۔

’’کیسے بری بات ہے۔‘‘ اس نے مریاں کو اپنی طرف کھینچ کر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سینے کا سہارا لے کر بیٹھے اور وہ بیٹھ گئی۔ایک عورت کو سامنے بٹھا کر کچھ دیر دیکھتا ہے اور اسے سو روپے دے کر اپنے کمرے میں آ کر سو رہتا ہے۔بتاؤ اس میں کون سی بری بات ہے؟‘‘

مریاں خاموش رہی۔

’’میں تو کہتا ہوں کہ بہشتو کی جگہ پہلے دن سے تمہی کو وہاں بٹھا دیتا تو کچھ ایسی خراب بات نہ تھی۔‘‘

مریاں اس کی گرفت سے چھوٹ کر وحشت سے قدم اٹھاتی شیرو کے پاس گئی۔اس کے منہ پر سے کھیس نوچ لیا اور بولی۔’’ اسے دیکھ رہے ہو؟‘‘

شیرو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔فضلو نے لپک کر اسے لٹایا، تھپکا اور مریاں سے پوچھا۔’’ مجھے تم نے ایسا ہی کمینہ سمجھ لیا ہے؟ میرے چھ سال تمہارے سامنے ہیں۔میں اپنی مریاں کو کسی دوسرے کے حوالے کروں گا؟ چوٹی پر سے نیچے چٹانوں پر نہ کود جاؤں گا اس

کے بدلے۔سور کی بچی۔یقین ہی نہیں کرتی۔مفت میں روز کے ایک سو روپیہ مل رہا ہو تو ہمارا بگڑے گا کچھ نہیں اور بنے گا بہت کچھ۔اور ابھی ساون کے دس بارہ دن باقی ہیں، ہم آسانی سے ایک ہزار کما کر نیچے وادی میں جا سکتے ہیں۔اور عزت سے جی سکتے ہیں۔وہ تمہیں صرف دیکھے گا، تم اسے دیکھتی رہنا، قصہ ختم۔''

لیکن مریاں پر تو ایک ہی وحشت تھی۔وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی، پھر زور زور سے پاؤں پٹخنے لگی۔''بے حیا۔''وہ چیختی رہی اور دروازے میں بہت سی جھریاں اگ آئیں۔باہر درختوں پر چڑیاں اور کوے بولنے لگے تھے اور بادل کہیں بہت دور گرج رہا تھا۔وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور کہتی رہی۔''بیٹھے بیٹھے کنجر پن اتر آیا کمینہ کہیں کا۔حرامزادہ۔شرم نہیں آتی۔جوتوں سمیت گھسا آرہا ہے۔آنکھوں میں آگ جلاتا ہے اور اوپر سے تیل گراتا اور کہتا ہے کہ آگ بجھ رہی ہے۔کہتا ہے یہ آگ نہیں جل رہی، یہ تو چاند چمک رہا ہے۔اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس رات بھر رہنے کو۔۔۔مجھ سے!۔۔۔''وہ سینہ کوٹ کوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

فضلو شیرو کی کھاٹ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔اس سے لپٹ جانا چاہا مگر وہ چھوٹ کر پرے جا گری، فضلو نے اٹھ کر اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔مریاں نے اس کی طرف امید سے دیکھا۔

وہ بولا۔''ارے وہ کچھ بھی نہیں کہتا۔''

مریاں پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فضلو بولتا رہا۔''سور کی بچی، تمہاری قسم کھا کر کہہ چکا ہوں کہ وہ چھوتا تک نہیں۔بس دیکھتا ہے اور سو روپے دے کر سو رہتا ہے۔تو مانتی نہیں۔''

اچانک مریاں تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔''اگر تم ایسے ہی بے غیرت ہو گئے ہو تو ایک شرط ہے۔''

''بتاؤ۔''فضلو بھی کھڑا ہو گیا۔

''پہلے شرط بتاؤ۔''اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں رات کو صاحب کے پاس جاؤں گی، اگر اس نے مجھے چھو لیا تو پھر میں تمہاری نہیں رہوں گی۔پھر میں جہاں چاہوں گی چلی جاؤں گی۔''اس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہ تھا۔

فضلو نے بغیر کسی جھجک کے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔''مان لی شرط پگلی تو سمجھتی ہے کہ تینوں کی تینوں جھوٹ بولتی ہیں۔تو سمجھتی ہے ایسا ہی ذلیل ہو گیا ہوں؟''

''خدا کی قسم بھی کھاؤ۔''مریاں نے کہا۔

''خدا کی قسم بھی کھاتا ہوں۔''وہ ہنس کر بولا۔''ارے وہ تو صرف دیکھتا ہے۔۔۔اچھا میری بھی ایک شرط ہے۔''

''کہو۔''

''اگر وہ تمہیں چھوئے تک نہیں تو جب تک وہ یہاں ہے تم اس کے پاس جاتی رہو گی۔''

مریاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''قبول ہے۔''

وہ باہر جا کر چائے کا سامان کرنے لگی۔

اور اس نے تمہیں دیکھا تک نہیں مریاں'' اس نے باہر جا کر کہا۔ ''اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ تم کون ہو۔''

وہ خاموش رہی، وہ دن بھر خاموش رہی اور جب شام کا کھانا بھی ہو چکا اور شیرو سو گیا تو وہ پہلی بار بولی۔ ''لے۔''

اس کی آواز میں اتنے بہت سے کانٹے تھے جو فضلو کے کانوں کے پردوں میں ٹھنس گئے مگر وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آ گیا وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پھر جب وہ صحن میں پہنچے تو مریاں نے کہا۔ ''فضلو۔''

فضلو رک گیا۔ ''ہاں۔''

وہ بولی ''شرط یاد ہے نا؟''

''یاد ہے۔'' فضلو بولا۔ ''بے فکر رہو۔''

اور جب وہ مریاں کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر اور ایک سو دس روپے لے کر باہر صحن میں آیا تو پلٹ کر دیکھا، کھڑکی اور دروازہ دونوں بند ہو چکے تھے۔ یہ روز ہی تو بند ہو جاتے تھے اس وقت! وہ کوٹھری میں آیا وہاں جیسے بھوت کونوں میں دبکے بیٹھے تھے اور چراغ کی لو میں ایک چڑیل ناچ رہی تھی۔ وہ شیرو کی کھاٹ پر بیٹھ گیا پھر اسی کے پاس لیٹ گیا۔ شیرو کچی نیند میں تھا بولا۔ کیا ہے؟ کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' فضلو نے پیار سے کہا۔ ''آج میں اپنے بیٹے کے پاس سوؤں گا۔''

شیرو مارے خوشی کے اس سے لپٹ گیا اور پھر اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے سو گیا۔ فضلو دیر تک اسی طرح اکڑا پڑا رہا۔ اور جب کمر دکھنے لگی تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کتنی دیر تک وہ ٹہلا کیا، پھر چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کی، مگر بھڑک کر اٹھا، چراغ جلایا اسے مریاں کی کھاٹ کے پائے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی لو کو دیر تک دیکھتا رہا۔ باہر شائد بادل کھل گئے تھے کیوں کہ سفید چاندنی نے جھریوں میں جان ڈال دی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آیا مگر رئیس خانے کی طرف نظر اٹھتے ہی وہ بھاگ کر اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اس سے کچھ یوں لگ کھڑا ہو گیا۔ اور دھم سے دروازہ کھول کر رئیس خانے کی طرف بھاگا۔

ایک موٹر رئیس خانے کے پہلو سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور ناگن کی طرح تیزی سے نیچے وادی کی طرف تیر گئی۔ فضلو پاگلوں کی طرح سرپٹ بھاگا۔ رئیس خانے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو گھونسوں سے کوٹ ڈالا۔ ''مریاں۔'' وہ چلایا۔ اور مریاں کے نام کے حروف بہت سی نیچی اونچی چیخیں بن کر پہاڑوں میں بجنے لگے۔ دور موڑ کاٹتی ہوئی موٹر کی روشنی اس کے فق چہرے پر سے گزرتی ہوئی غایب ہو گئی۔ اس نے موٹر کا پیچھا کرنے کے لیے نیچے گھاٹیوں کی طرف کود جانیکی سوچی۔ اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلا لالٹین کی روشنی باہر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی صحن کے ایک حصے تک بہتی چلی گئی۔

دروازہ مریاں نے کھولا تھا۔

''آ پہنچے؟'' مریاں نے کہا۔ ''تم شرط ہار گئے ہو حرامزادے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔۔۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگی۔ ''کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ لے گیا۔ اس نے مجھے بھنبھوڑ ڈالا۔ رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا۔ اس نے مجھے نوچا، کھسوٹا، اس نے میرے گال چاٹ ڈالے، اس نے۔۔۔''

مگر فضلو وہاں نہ تھا۔ وہ سر جھکائے کوٹھری کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بدلی نے چاند کو چھپا لیا تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔ اور شیرو رونے لگا تھا۔ مریاں اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اور روتی اور بلکتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولتی چلی گئی۔ ''تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوئے گا ہی نہیں۔ اس نے مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے۔ وہ تو پچھلے ساون میں بھی میرے ہی لئے یہاں رکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں مجھے دوربین سے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اب کے بھی میرے ہی لئے آیا تھا۔ سن رہے ہو؟ سن رہے ہو حرامزادے؟ بھاگ کے کہاں جا رہے ہو؟''

فضلو اب نہایت تیز تیز چل رہا تھا اور مریاں اس کے پیچھے بھاگنے لگی تھی وہ بولتی گئی تم شرط ہار گئے۔ لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو، کہیں سے عزت آبرو بکاؤ ملے تو چٹکی بھر خرید کر رکھ لینا۔ کیونکہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات، کمینے اور کنجر ہو گئے ہو؟ سمجھے؟ اور اب میں جا رہی ہوں، میں جہاں بھی جا رہی ہوں۔ تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، میں اب کسی کی نہیں رہی۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا ہے۔ تم نے میرا سب کچھ لٹوا دیا ہے۔ حرامزادے۔''

فضلو اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا گیا، تیورایا اور پھر دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر دروازے کی طرف رینگا۔ اندر شیرو زور زور سے رو رہا تھا۔ اور مریاں چیخے جا رہی تھی۔۔۔ ''وہ دو مہینے اس ایک گھڑی کے لئے سکیسر پر پڑا رہا اور وہ ''مریم، مریم'' کی رٹ لگانے اور رونے کے بعد مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کتا کچے گوشت پر جھپٹتا ہے۔ کرائے کی موٹر کا اس نے رات ہی انتظام کر لیا تھا۔ اور وہ ابھی ابھی مجھے آخری بار بھنبھوڑ کر موٹر میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا ہے۔ اور تمہیں بخشش دے گیا سو روپے کی اور ایک ایسی مریاں کی جو اب اس کوٹھری میں نہیں گھسے گی۔ وہ نیچے وادی میں اتر جائے گی۔ وہ میدانوں میں چلی جائے گی اور جب بھوک کے مارے اس کا پیٹ زخم بن جائے گا تو کپڑے اتار کر راستے میں بیٹھ جائے گی۔ ننگے مردوں کو لوگ پتھر مارتے ہیں پر ننگی عورتوں کو بستر دیتے ہیں اور روٹی کھلاتے ہیں تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔''

آس پاس کے بنگلوں میں کتے مریاں کی چیخیں سن کر بھونکنے لگے تھے اور سکیسر کی پہاڑیاں جھیل کی طرا ترتی ہوئی موٹر کی بھنبھناہٹ کو دہرائے جا رہی تھیں۔ اور مریاں کے واویلا کو دہرائے جا رہی تھیں اور کتوں کی آوازوں کو دہرائے جا رہی تھیں۔

پھر ایک دم جیسے مریاں پر وحشت سوار ہو گئی لپک کر اس نے لڑکھڑاتے ہوئے فضلو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ فضلو سر اور گھٹنوں کے بل دھب سے گیلی زمین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

وہ پلٹی اور کوٹھری کی پچھلی طرف پرانے کھو کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک پر آ گئی سر پر ہاتھ رکھے اور روئے جا رہی تھی اور نیچے وادی کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اور چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔

ایک موڑ پر جا کر وہ تھم گئی۔ شیرو کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں'' اس دوسرے حرامزادے کو ایک آخری بار دیکھ لوں۔'' اس نے

فیصلہ کیا اور واپس رئیس خانے کی طرف بھاگی۔

فضلو اسی طرح دروازے کے پاس سر اور گھٹنوں کے بل بے حس وحرکت اوندھا پڑا تھا۔ اور شیرو کا گلا چیختے چیختے بیٹھ گیا تھا۔ مریاں نے دروازہ کھول کر اندر جانا چاہا مگر پھر جیسے کسی تیزی سے فضلو کے پاس آ گئی۔ ایک لمحہ بت کی طرح جمی رہی۔ پھر جھک کر اسے بٹھانا چاہا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ کیچڑ اور لہو نے اس کے چہرے کو نہایت خوفناک بنا دیا تھا۔ اور اوپر بدلیوں میں دوڑتے ہوئے چاند نے اس گھناؤنے پن کو چمکا دیا تھا۔

''میرا فضلو۔'' اس نے فریاد کی۔

پھر اندر کوٹھری میں جا کر چراغ اٹھایا۔ شیرو بھاگ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ وہ چراغ اٹھائے باہر آئی تو شیرو بھی اس کا پلو تھامے باہر چلا آیا۔ وہ چراغ کو فضلو کے چہرے کے قریب لا کر اور اس کے پپوٹے اٹھا کر اس کی پتلیوں میں زندگی کے آثار ڈھونڈنے لگی۔

''میرا فضلو۔'' میرا مالک، میرا سائیں۔'' اس کے بین چار طرف گونج اٹھے اور پھر ایکا ایکی تھم گئے۔ فضلو کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا، مٹھی کھلی اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے نوٹ کو چراغ کی لو سے جلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔''

شیرو اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے میری غریبی دھوکہ دے گئی مریاں۔'' فضلو نے رکتے رکتے کہا۔

نوٹ کی راکھ سکڑ کر گری اور رئیس خانے کی طرف اڑ گئی۔

''مریاں۔'' فضلو نے التجا کی۔

''تم مرو گے تو نہیں؟'' مریاں نے سسکیوں میں پوچھا۔

''نہیں۔'' فضلو نے بڑے یقین سے کہا۔

''حرامزادے۔'' وہ بلک بلک کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

''سور کی بچی۔'' وہ اس کے بالوں کو خون آلود ہونٹوں سے چومنے لگا۔

موٹر نیچے جھیل کے کنارے کنارے تیرتی جا رہی تھی۔

مامتا

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے ایک افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ اتار دیا۔ جہاں چینی بستے تھے۔ اور انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ برآمد کیے جاتے تھے۔ لیکن اب ادھر ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا۔ اس لئے ہانگ کانگ پولیس کیلئے پنجابی نوجوانوں کی مانگ دگنی ہو گئی تھی۔ میں کچھ ایسے گٹھے ہوئے ان نہیں ہوں۔ فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے۔ مگر اب کے ڈاکٹر نے میری پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا اتنے دراز قد سپاہی کو دیکھتے ہی چینی بالیشتے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ مجھے لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بڑے مزے ہیں۔ اس ملک میں پولیس کے بڑے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے۔ ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گداگر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی سمت بھگا دو اور جب ان کی گودوں میں سے ان کے بچے پاؤں سے جوتوں کی طرح اتار دو۔ تو ان بچوں کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر ان کی ماؤں کی طرف اچھال دو اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں آ کر اس روپہلی خدمت کی سنہری سند حاصل کر لو۔ کولون اور اصلی چین کی سرحد پر ہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے پھر چین میں دھکا دے دو، سمندر کنارے کی سیر گاہوں میں گھومتی ہوئی نوجوان چینی لڑکیوں میں سے جسے چاہو چن لو اور اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی اس کی ماں کی مٹھی میں کوئی ٹھیکری تھما کر لڑکی کو اپنی بارک میں لے جاؤ اور پوری بارک کو محفوظ و ممنون کرو۔ اور اگر کوئی سارجنٹ چھاپا مار بیٹھے تو لڑکی کو اس کے حوالے کر کے چین کی نیند سو جاؤ۔ غرض بڑے مزے تھے۔ لیکن جب ہمارا جہاز سنگاپور پہنچا تو ایک مدراسی جہازی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے والی ہے۔ جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا اور سنگاپور ہی میں انگریز پولیس کے سپرد کر دیا۔۔۔ تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں سے چھلکتی معلوم ہوئی۔ جنگ ہونے والی ہے۔ جنگ ہونے والی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں پیدا ہو گئی تھیں۔ اور لوگ یوں تیورا تیورا کر چلتے تھے جیسے قدم قدم پر ان کے سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے۔ ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں کی پٹریوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے جیسے بمباروں کے انتظار میں ہیں۔ ان کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اچٹتی ہوئی پپڑیوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا۔ ''جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں ہو چکتا۔'' پناہ گزین عورتیں مارے خوف و ہراس کے قبل از وقت بچے جن رہی تھیں۔ بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ ایک انگریز حکمران نے تو انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض نہیں۔ جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں ان کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے ہونے چاہیں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے جائے اسے کولون کی سرحد پر لے جا کر اصلی چین میں دھکا دینا چاہیے۔ پولیس کے لیے پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹریاں صاف رکھنے کا کام سخت دشوار ہو رہا تھا۔ مورچے کھدر ہے تھے۔ پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی تھیں، عمارتوں کے حسن کو ریت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ سارے کا سارا ہانگ کانگ زیر تعمیر ہے۔ شام کے بعد ہانگ کانگ اور کولون پر الو بول جاتا تھا۔ کہتے ہیں ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اوپر انہی روشنیوں کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن رینگنے لگتی تھی۔ مگر اب تو ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی تربیتی پریڈ سے تھک ہار کر بارک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے ادھر ادھر کی مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا۔ مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بمباروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کر کے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں۔ اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب کے بشرے پر اس معصوم بچے کی سی لٹی لٹی کیفیت تھی جس کے منہ سے قبل از وقت دودھ کھینچ لیا جائے۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی۔ مگر دن بھر کے ہنگاموں میں اس تصور سے بار بار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا تھا۔ اور کہا تھا۔ ''ہانگ کانگ تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ بیٹا تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمہیں خوابوں میں تو ٹٹول لیتی۔ پر تم تو ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ تمہارے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر ادھر بھی ہونے لگی اور تمہارے دشمنوں پر بھی کوئی آنچ آ گئی تو بتاؤ میں یہاں اس اجڑے بچڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی۔ نہ جاؤ میرے بیٹے مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا۔ تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمہاری آنکھوں میں گری ہوئی پلک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟۔۔۔ اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیا ہو گیا تو؟ پچھلے سے پچھلے سال کی طرح میری زبان

کوئلہ ہوجائے اگر دشمنوں کے آدھے سر میں درد اٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ۔ چلو میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ، بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تو مریں گے۔ اور بیٹا اگر تم ہانگ کانگ میں ہوئے اور ادھر میں مرگئی تو میری قبر میں تمہارے حصے کی وہ مٹھی بھر کون ڈالے گا جو مولوی جی کہتے ہیں۔ ماں کی قبر کے اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے بتاؤ''۔ لیکن میں چلا آیا تھا۔ اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا۔ اور رات کو بارک میں مجھے اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں سے ڈرنے لگتا اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا۔ ''ماں تمہاری پلکیں جھپکتی ہی نہیں۔ تمہاری پتلیاں تو ہلتی ہی نہیں۔ تم کسے دیکھ رہی ہو ماں؟'' اور یہ سوال میں اس لئے پوچھتا تھا کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح افق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آنکلے۔ پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں اور پھر گردنیں نیہوڑا کے تھکے اژدھوں کی طرح لیٹ گئیں۔ بجلی اور تار کے اکھڑے ہوئے کھمبے بلندی پر سے پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے پناہ گزینوں کا بھیجا چاٹتے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی۔ دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں ہال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہوگیا۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی۔ ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا۔ جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں تک۔ ''ممی ممی۔'' کراہ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے۔ اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی کو مسلے جارہی تھی اور جب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو ''میرا بیٹا۔'' کہہ کر دھم سے گر پڑی۔ اور ہم سب کے منہ لٹک گیے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہوگئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنادیا گیا۔ اور روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں۔ جیسے جنگ نے میری بانہوں سے میری ماں کو کھسوٹ لیا ہے۔ جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ میرے سامنے نہیں ابھرا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے۔ ہر طرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں قیدیوں کے باڑے میں بندر پڑا رہا۔ میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا۔ اور جسم بالکل کھوکھلا ہوگیا تھا۔ کبھی بھولے سے سرہلاتا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے۔ بعض اوقات پھیپھڑوں میں

سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی۔ اور میں سینے پر گھونسے مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔ مگر جلد ہی اس میں قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں نے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی۔ میری قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔ "اسے باندھ لو!" ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔ حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر الٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سر بلند مسکرا دیا۔ "مسکراتا ہے؟" ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور پھر ایک گولی سن سے آئی اور سر بلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے لئے میں مر گیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشا ہنستے سنا تو ہوش آیا۔ ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ گولی سر بلند کے جسم نے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی اور سر بلند پیچھے گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا۔ اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے۔ اور وارث کی موت جاپانیوں کے لیے لطیفہ بن گئی تھی۔ اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کر لی۔ حکم ملے تو مسکراؤ حکم ملے تو نظریں اٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے تر کرنے کے لئے منہ کا لعاب نگلو اور اگر حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی طرح جس انداز اور جس رخ پر کھڑے ہو کھڑے رہو۔ اور پھر جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی۔ کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا۔ ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی۔ جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور میں کبھی گستاخی نہیں کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجالاتے رہے۔ ہم پھٹی ہوئی نیکروں میں کاغذ پھنسا کر ستر پوشی کرتے تھے اور ٹوٹے ہوئے بٹنوں والے گریبانوں میں سے جھانکتے ہوئے سینے کو بازوؤں سے ڈھانپ رکھتے تھے۔ اور ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیروں میں سے ایک چھوٹے سے جزیرے پر سوڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے۔ اور اب وہ ہانگ کانگ تک پر چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں۔ ان کی گوشمالی کے لیے ہانگ کانگ سے جاپانیوں کا ایک دستہ جانے والا تھا۔ جس میں وفادار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرفہرست تھا۔ رات کے دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے، آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی۔ اور میری قمیص کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھر گئے تھے۔ ایک دوسرے میں گھستے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے۔ نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیئے تھے۔ اتنی جلدی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری

پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی پیالی کی طرح نمودار ہوگئی۔اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں، ان کے قریب آکر غایب ہو رہی تھیں۔جھونپڑوں کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ان کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ان کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ تھا اور پھر سب کے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا۔بالکل کھلونا۔اور جب میں سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک ہمیں جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھتا تھا۔کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا، تنگ آکر راستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ ابھار سکا۔بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کر کے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑیوں میں بھاگ گیا۔چڑیاں بہت سی ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اڑ گئیں جیسے ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر ہی دم لیں گی۔

اب ہم نے ہلہ بول دیا۔جھونپڑوں کے قریب آکر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کر دیئے اور پھر جاپانی افسر نے چینی زبان میں کہا۔"اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آ جائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آکر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔"

اور پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو صرف جنوں پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑیوں میں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئی بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔آن کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہرے، لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں۔اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا۔ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھاس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے۔اور عورتیں زیر لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔کچھ ایسی پراسرار فضا پیدا ہوگئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرا دے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔پر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا۔"مرد کہاں ہیں؟"

ایک لمحے تک کچھ خاموشی رہی جیسے توپ میں گولا ابھر رہا ہے۔

پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بڑھیا ایک قدم آگے آ گئی اور بولی۔"روز کے کام پر گئے ہیں۔"

روز کے کام پر۔"لیڈر کڑکا۔" یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لئے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟"

"جی نہیں۔" بڑھیا بولی۔"مچھلیاں پکڑنے۔"

اور بچے اور بوڑھے؟''افسر نے پوچھا۔''اور تمہاری لڑکیاں؟''

''آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلہ ہے۔''بڑھیا اسی انداز میں بول رہی تھی۔''سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور۔۔۔۔''

''ادھر آؤ''لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا۔وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تن کر ٹھنڈی ہو گئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی۔سب عورتیں چہروں کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ کرچ سے میرا دانت میرے گوشت میں اتر گیا۔

چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ آئے تھے روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر ادھر ادھر اڑ گئے جیسے گولی انہیں کے ہجوم میں سے گزری ہے۔

دور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔

ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے۔خوب خوب اٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا۔ان کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یا جانے کس احساس سے کانپے جا رہی تھی۔اور ان کی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر کچھ سوچ رہی تھیں۔جاپانی جھونپڑوں نے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے۔اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی۔میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا زیر لب جاپ جاری کر دیا۔مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔میں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا۔اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں ان سب سے بے پروا ہو گیا ہوں۔آنکھوں کے گوشوں میں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت پھر زمین پر بیٹھ گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔مردہ بڑھیا کے پاس آ کر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔پھر جلدی سے لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی،کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا۔مگر میری آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سے آگے آ کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو اس کی جھریوں میں ندی کی طرح بہہ کر پھیل گئے۔سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا کر میری پسلیوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔اور میں رو رہا تھا۔میں نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا،ان سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔

میں بڑھیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔میں نے جھک کر اس کا سرا اٹھایا اور اس کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔ایک جاپانی سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت

کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لئے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دھانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور سب جاپانی واپس آ گئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کر رہا ہے اور انہیں میں سے کسی نے تمہیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں نوعمر لڑکیاں، بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جانے کے نہیں ہم آج سارا دن ان کا انتظار کریں گے۔ اور جب وہ آئیں گے تو تمہارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور باپوں کو تمہارے ہی سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے۔ اور پھر تمہیں بھی سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔'' وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور آخر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے تھیلوں میں سے شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں۔ بادل گھر آئے تھے جن کی وجہ سے سورج غائب تھا۔ اتنی دیر بعد میں بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی میں گریبان کے دونوں حصوں کو ملاتا تو میرا ہاتھ سن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا۔ بڑھیا کی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیر لب جاپ جاری تھا۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی کی کھنڈر رہی تھی۔ اور وہ منہ کھولے مجھے گھورے جا رہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی۔ جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر جانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اس کئے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لئے کھانا تیار کریں گی۔ اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑا رہنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

عورتیں اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں، بادل گرجنے لگا۔ ہوا میں جمی ہوئی برف کے ٹکڑے ارنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھروندے کے اس گوشے کو یاد کر رہا تھا جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کیے رکھتا تھا۔ اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی۔ ''سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا۔ ہوا میں جو نمونیہ ہوتا ہے وہ سینے ہی راہ پسلیوں میں اترتا ہے۔'' آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے ابھرا۔ جھریوں میں پھنسے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اٹھے تھے۔ بجلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آ رہا تھا۔

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا، آہستہ آہستہ میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ بار بار پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی جو دور ابھی تک ناچ رہے تھے۔

اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی۔ بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آ کر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے بولی۔ ''قیدی ہو؟''

میں زبان سے کچھ نہ بولا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی۔ ''میرا بیٹا جلدی میں تھا۔ میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سنی، اس کی قمیص میں بھی تمہاری قمیص کی طرح ایک بٹن نہ تھا۔''

میں چونکا۔

وہ بولتی چلی گئی۔ ''تمہاری ماں ہے؟''

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی۔ اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا۔ میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لئے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گرا پڑا ہوں۔''

الحمداللہ

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔کھدر یالٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاری والی ریشمی خوشابی لنگی، دوگھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستیوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑں تک پہنچتا تھا۔اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تھا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔سر پر بادامی رنگ کی مشدی لنگی جس میں کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ہاتھ میں عصا کی جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔بالوں میں کوئی بڑا کا فرتیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگران کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔اور پھر مولوی ابل کی آواز، شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ماہیے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھی کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہوجاتا۔ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع گئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آکر گرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس روپے گاؤں کے مسکینوں محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا۔"مجھے دعائیں نہ دو۔اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھروں میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔مجھے دعائیں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا، صحت، اطمینان، بے فکری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔مولوی ابل کے یہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں درڑا گیا۔اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظام تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہوگئی ہے۔زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہوا اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی ابل کی جان میں جان آئی یقیناً اولاد کی افراط خائے ذوالجلا کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی ۔مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی۔بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کرتی غائب ہوچکی تھی اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چولے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بنتے وقت جولاہے نے سوت

کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے۔ مطلا کلاہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بندوں جھمکوں کے نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی ابل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ تابڑ توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں مولوی ابل نے اپنی پہلوٹنی کی بیٹی مہر النساء کے لئے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدہ النساء کے لئے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی ابل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے، قیمتیں یوں ایک دم زن سے اوپر گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ کاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے۔ ایک چونی کما رہا ہوں۔ چلئے آپ چونی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریات زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابل خدا سے اپنی عمدہ کے لئے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولوی ابل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو یا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہٗ کو حاظر ناظر جان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں۔ اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی۔ اور اولاد کے ساتھ مولوی ابل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہر النساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا، ادھر مولوی ابل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل ایک ہی سجدے میں ظہر کی عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوئی مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا، کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہ ہوا تھا البقرہ نے النساء میں جا نکلا۔ اور سورہ رحمان پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی م یں اسے دو بار پڑھ ڈالا۔ چوہدری فتح اور کرسی نشین وممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے۔ "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چوہدری صاحب، آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں سمجھتا تا کہ ایک سورۃ کو دو بار کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔"

لیکن چوہدری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی ورنہ یہ چوہدری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر میں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا سکورا اس التزام سے بھجواتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چوہدری فتح داد بنفس نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا۔ "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں چودھرین ذرا بیمار تھیں اور کھانا نائین نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔"

یہ ”وظیفے۔“ مختلف نوعیت کے تھے اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔ مولوی ابل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آ جاتی تھیں۔ ادھر زیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے ”وظیفوں۔“ پر ذرا ذرا سی شکر رکھ لاتی تو زیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لئے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب سیر ہو کر کھاتے جو وظیفے باقی بچتے انہیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں ابال کر میٹھے ٹکڑے تیار کئے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی انسان کو پیٹ کو بھرنے کے لئے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لئے کپڑا بھی چاہیے۔ چوہدری فتح داد ہر نئی فصل پر مولوی ابل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب بھی یہ پوشاک گھر میں آئی ایکی درزی کی دکان سج گئی، زیب النساء، مہرن، زبدہ اور شمسن کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہبند کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں ننھوں کے بہت سے چولے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لئے مولوی کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آ نکلتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دئے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا۔ زیب النساء کے کنگن جو کبھی س کی سانولی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے۔ اب ذرا جھٹکے سے پونچے پر آ جاتے تھے۔ اور اس کی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن چکا تھا۔ اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی ابل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی ابل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں بج اٹھتی تھیں مگر آواز کا ٹھاٹھ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پر بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس کی آواز میں ایک لرزش ضرور آ گئی تھی۔ جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کیوں کہ مولوی ابل اس سے مہر النساء کے لئے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چوہدری نے اس مقصد کے لئے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا۔ اور کئی نوجواں اسے جچے بھی تھے۔ مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی ابل کو سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہر النساء سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے ہیں جن سے مہر النساء کا جہیز تو کیا بنا ہو گا دوسرے نو بچوں کے لئے جوتا ٹوپی بھی شائد ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چوہدری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی ابل اور زیب النساء کی دعائیں رائیگاں نہ گئیں۔ انہی دنوں سابقہ خدایار اور حال شمیم احمد شہر سے گاؤں اٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔

خدایار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی ابل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنیکی کوشش کرتا رہا اور جب

مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے۔ اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصہ کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی بجائے شمیم احمد نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی ابل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز مولوی ابل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لئے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا۔ ''عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے وہ میری بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا۔ تم کہو تو مہرن کے لئے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں۔ جہیز کے لئے ضرورت تو ہے ہی۔ ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی اس لئے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو وہ پرانا شاگرد ہے۔ اور دوسرا حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نور نظر ہے۔ تیسرے۔۔۔'' مولوی ابل نے رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا۔ ''عارف کی ماں، اللہ جل شانہٗ کی قسم مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے مہرن ہی کے لئے آسمان پر سے اتارا ہے۔''

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لئے تو بھوبھل میں بدل گئی ''تمہارے منہ میں گھی شکر۔'' وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی، صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی ابل کے سامنے رکھ دیا۔ ''خدا تیری زبان مبارک کرے۔ میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پراٹھا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا ہے۔'' وہ رونے لگی۔ ساتھ ساتھ مسکراتی بھی رہی۔ اور جب مہر النساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھتی بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا الٹ کر رکھ دو ورنہ سب ٹکڑے کووں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی''۔۔۔ اور مہر النساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ سب سمجھتی ہوں ماں۔ شمیم احمد کی دکان پر ابا میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہر انساء باہر چلی گئی تو مولوی ابل نے ڈبے کا کل متاع پینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''دعا کر، کہیں مہرن کی شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لئے بالکل پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔''

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی ابل شمیم احمد کی دکان کو چل دیا۔

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی ابل دکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں پر بچھ بچھ گیا اور جب مولوی نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن پاک کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھول تھے اور نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے۔ ''ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو۔''

مولوی ابل نے معمول سے زیادہ بلند آواز میں کہا۔ اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی ابل کے سامنے یوں رکھ دیا

جیسے مفت میں۔۔ محض تحفہ پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی ابل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا۔ صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔ شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا۔ کھنکارا اور بولا۔ "چھ روپے گز کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی ابل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جم گئیں۔ مولوی ابل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا۔ "قبلہ نے بوہنی فرمائی ہے اس لئے میں نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں پھر تلافی کر دوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولوی ابل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد کو کہہ دے۔ "اللہ جل شانہٗ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد، اس لئے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے۔" لیکن یہ تو ایک دم سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا جس پر اٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور بولا۔ "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی، اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین!" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین۔" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور بے قراری اور چھبن کو دیکھ کر مولوی ابل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا۔ "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری مہرن کا سہاگ مہکے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام مولوی ابل کے دروازے کی زنجیر بجی۔ اس وقت آنے والے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر لاتے تھے۔ اس لئے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی ابل کو کیا سوجھی، خلاف معمول کڑک کر بولا۔ "ٹھہرو۔" بچے رک گئے۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء تو رو دی۔ مگر مولوی ابل ان کو دلاسہ دیئے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا، جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فوارہ سا اُمڈا اور ساتھ ہی آواز آئی۔ "السلام علیکم قبلہ!"

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لئے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہبند ٹین کی طرح بج اٹھا اور جب اس نے رک رک کر کہا۔ "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ۔ اس لئے آپ کو بے وقت زحمت دی۔" تو مولوی ابل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اڑتی ہوئی مہک کچھ گنگناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی۔ لیکن مولوی ابل گردن موڑ کر پکارا۔ "میں ابھی آیا عارف کی ماں۔" اور پھر شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہبند کا شور وغوغا روکنے کے لئے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے۔ دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا اور یہ اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لئے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر

مولوی ابل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھالایا اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کر شمیم احمد کے پاس آیا شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور ڈاڑھی کے خشخشی بالوں پر عطر حنا دیئے کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

''کہو۔'' مولوی ابل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لئے ایک ایوان کی آرائش وزیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے، پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا، جس کی لو دھواں چھوڑ رہی تھی، آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا۔ ''آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں۔''

''کہو کہو۔'' مولوی ابل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں۔

''کہو نا عزیزم۔''

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا۔ ''اصل میں یہ کام تو میری ماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے تھا، مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے، بات بات پر رو دیتی ہیں اور برا بھلا کہنے لگتی ہیں۔ سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں۔''

''تم نے اچھا کیا۔'' مولوی ابل نے بڑی شفقت سے کہا۔

''میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔'' شمیم احمد نے سمٹتے، پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا۔ ''میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کیلئے۔۔'' اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا۔۔۔ ''حضور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی غلامی میں لے لیں۔''

شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی ابل کا جی چاہا کہ چٹکی بجا دے، رسماً ذرا ہانپتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد۔''

شمیم نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی ابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ ''غلامی'' کا مطلب نہیں سمجھا۔ دبی دبی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی۔ ''جی میرا مطلب ہے کہ حضور۔۔۔ حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیں۔''

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی ابل کی تسلی ہو گئی۔ اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا اور جب مولوی ابل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی ابل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے رک گئے تھے۔ شمیم احمد کی داڑھی پر عطر چمک رہا تھا

اور مولوی ابل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں ڈھیروں دھواں اگلنے لگی تھی۔ مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔ مولوی ابل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہُ۔۔۔کتنی مسکین۔۔'' اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انہیں پرولیا۔ ''دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو۔ بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے۔۔۔آؤ۔ ادھر آؤ'' اور مولوی ابل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا ''کہاں سے آ رہے ہو؟'' عطر کی لپیٹیں آنے لگی ہیں۔''

مہر النساء توے پر آخری روٹی ڈالے بیٹھی تھی، بولی، ''سچ ابا جی، سارا گھر مہک اٹھا ہے۔''

''کیا بات ہے؟'' زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی ابل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا۔ اس لئے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے۔ سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لئے بولا۔ ''آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا۔'' لٹکتے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہر النساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

''بات سنو عارف کی ماں۔'' مولوی ابل نے باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا۔ ''میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو۔''

مولوی ابل چہکا، ''اللہ جل شانہُ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو اللہ جل شانہُ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی۔!'' اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی۔ وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ بھی تو کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی داڑھی رکھ دی۔

''دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں۔'' مولوی ابل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا۔ ''الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا، یوں دیتا ہے، چھپر پھاڑ کر سنتی ہو زبین۔'' آج مولوی ابل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کی عارف کی ماں کے بجائے زبین کہہ کر پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔ ''جب شمیم احمد خدا یار تھا، جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا مہرن کو جیسے۔۔۔کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو۔۔۔اللہ قسم۔''

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف

دوڑے۔

''ٹھہرو۔'' اب کے مولوی ابل کی آواز میں ڈانٹ تھی۔ ''میں جاؤں گا۔'' پھر بچوں کے پاس آکر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا۔ ''ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے۔ سمجھے؟'' ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لئے بھی آنکلتے ہیں سمجھے؟ جاؤ۔'' پھر ذرا بلند آواز میں بولا۔ ''انہیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو مہرن بیٹی، یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایا ہیں۔''

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چوہدری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی ابل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا۔ ''مبارک ہو قبلہ! ہزار بار مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں۔''

اس وقت مولوی ابل کی نظروں میں چوہدری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی۔ ''اللہ جل شانہٗ کا شکر اور آپ کا احسان ہے۔'' اس نے چوہدری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

''خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا۔'' چوہدری فتح داد بولا۔ ''اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجئے۔ شمیم احمد اچھا لڑکا ہے۔ پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دکاندار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دکان پر آتی ہیں۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا ننگا زمانہ آ لگا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہیں ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب پڑے پڑے بھک سے ہو جائیں۔ شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں تو م ڈالتی ہے۔ کم بخت۔ ابھی ابھی شمیم احمد نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا۔ کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجئے۔ سو میں اسی لیے حاضر ہوا۔ آپ کل تک سوچ لیجئے اور یہ۔۔۔ یہ۔۔۔'' چوہدری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی۔۔۔ ''یہ میری بیٹی کو دے دیجئے گا۔''

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چوہدری نے آہستہ سے کہا۔ ''اللہ قبول فرمائے۔''

''آمین۔'' مولوی ابل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آکر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے۔ جن کی بڑے سے بلبلے جتنی کٹوریاں میں جانے نگینے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چہکی۔ ''شمیم احمد نے بھیجے ہے؟'' اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ مہر النساء بھاگ کر نکل گئی۔

''ارے!'' مولوی ابل نے حیرت سے زیب انساء کی طرف دیکھا اور دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

''سمجھ گئی!'' زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشت شہادت کو ناک کی کیلی پر رکھ کر بولی۔

''تم نے بھی تو منہ بھر کر کہہ دیا۔۔۔ شمیم احمد بھیجے ہیں؟''

مولوی ابل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے محظوظ ہو کر

زور زور سے ہنسنے لگے۔ عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھمکوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''چوہدری فتح داد دے گیا ہے مہرن کے لئے۔'' مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور رواداری میں راز فاش کیا۔

''اللہ قبول فرمائے۔'' زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے پیروں میں مہندی تھوپ دی گئی۔

ڈھولک تو خیر نہ بجی، کیونکہ شادی کا گھر سہی پر آخر مولوی ابوالبرکات کا گھر تھا۔ جس نے حضور پرنور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دفیں بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا اور پنجاب اتنا بدنصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ ''دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا۔'' مولوی ابل نے میراثنوں کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں الاپوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی پھولوں اور پھواروں ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گولے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی ابل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ڈھول کی ہر چوٹ مولوی ابل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی ابل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے گھسیٹنے، کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں۔ اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کا گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

''مولوی کے پاس دست غیب کا تعویذ ہے۔'' کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلی میں انگلی ڈبو کر کہا۔ ''کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لئے ہیں، کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ گھڑ ہے اس لئے اولاد کے لئے چھوڑے۔ یہ کنگن اور یہ ناک کی کیل، یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟'' اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہر النساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکنیوں اور چھوہاروں کی ایک لہر سی اس پر سے نچھاور ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے، مولوی کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے، ایک دم یوں اچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچک دار کمانیاں بھر آئی ہیں۔

''ٹھہرو۔'' مولوی ابل گرجا۔ کمانیاں دھرتی میں اتر گئیں، بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی ابل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی ابل کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہروں کے لئے بانٹ لیا

ہے۔ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخایا اور پلٹ کر گھر جانے لگا۔

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی ابل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور کھجلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی۔ لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النساء شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی ابل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے بڑے دائرے بنا کر بولی۔ ''ہمارے لئے تو بس یہ قبرستان کا سناٹا چھوڑ گئی ہماری مہرن۔''

''تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔'' مولوی ابل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا۔ ''مہرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا شمشن بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟'' پھر ذرا رک کر بولا؟ ''عارف میاں! زبدہ کیا کر رہی ہے؟''

''جی رو رہی ہے۔'' عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

''کہاں؟'' مولوی نے پوچھا۔

''جی جہاں مہرن آپا مایوں بیٹھی رہیں۔'' عارف بولا۔

''زبدہ۔'' مولوی ابل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیلا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا۔ اور زبدہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چمکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور۔۔۔۔۔۔۔''

مگر مولوی ابل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آ گیا تھا۔ مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑ پھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آ کر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی ابل نے زیب النساء کے ہاتھ کو ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے۔ ''عارف کی ماں! سنو، یہ زبدہ تو جوان ہو گئی ہے۔''

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہرن کے عقب میں بیٹھی پلتی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی ابل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''فکر نہ کرو بیوی۔ اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں سا مایوس ہونا کفر ہے۔''

زیب النساء نے مولوی کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر سے گرا دیا۔

''شرم کرو پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے، اب کندھا سہلا رہے ہو، جوان جہان بیٹاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے۔۔۔۔''

زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا وہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی ابل نے ذہن میں ایک خیال آیا، پکارا شمسن!''

شمسن النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی ابل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لئے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمسن النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی، پھر تلوے کا خم جھکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لپک لپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں، تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں جاؤ۔'' مولوی ابل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمسن النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النساء زار و قطار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمسن اس کی طرف لپکیں۔

مولوی ابل نے باہر جا کر چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکنی اٹھا کر جیب مین ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قمرن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے ننھوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا اس لئے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور اس ء لئے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد ابالے جانے لگے۔ نمازیوں کی بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی ابل اذان دے کر وہیں بتھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو بڑی وقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین کی خدمت کی برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا۔ ''تمہیں یاد ہو گا کہ کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا؟ کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی! کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں۔ کیوں ہو رہے ہیں، کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے، اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔

یہ قہر الٰہی ہے، یہ آثار قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ۔۔۔'' اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے۔ پھر وہی سناٹا عود کر آتا۔ جس میں زبدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمسن کا جسم لچکتا۔ ٹین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری بنٹے بجتے اور تالیاں بجاتے اور قمرن کی گڑیاں ننگی ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتیں۔

مولوی ابل کے دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے، اللہ جل شانہٗ اور چوہدری فتح داد اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی

ابل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی اور مہر النساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبدہ اور شمسن کے لئے رشتوں کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے میں آتا تھا۔لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہر النساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت سے وہ زبدۃ النساء اور شمسن النساء کے لئے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھی۔ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔شمسن نے ابھی قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔میں ذرا ذرا سی پونی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر میں پہنچ آؤں؟ زبان وبان نہیں دوں گا۔اگلے سال دیکھا جائے گا۔''

''دیکھا جائے گا۔''وہ زیب النساء سے زندہ اور شمسن پر بے تحاشا آئی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا۔''اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔توکل بڑی چیز ہے عارف کی ماں!

کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہٗ پر توکل کرتا ہے۔توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے یہی توکل بیج کو چٹخاتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے اور سبز پتیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے۔سمجھیں عارف کی ماں!''

''پر کسان بیج بوتا ہے۔!''زیب النساء بحث کرتی۔''تم نے کیا کیا ہے؟''

''الحمدللہ۔''مولوی ابل کا ذہن چوہدری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔آج کتنے برسوں سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا۔اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پاشاک پہنائی تھی،اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔لیکن اب چند روز سے چوہدری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جراحی کا کام کر رہا تھا۔چوہدری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سوج کر پھوٹ پڑا اور بہنے لگا۔ساتھ ہی چوہدری کو لرزے کے بخار نے آلیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ان دنوں مولوی ابل کے گھر پر مردنی چھائی رہتی۔ایک تو مہر النساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سوہان روح تھا اس پر چوہدری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے۔اللہ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو۔!''

مولوی ابل ان دنوں پر روز صبح و شام چوہدری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا۔مگر وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔بس اتنا ہوتا کہ مولوی ابل کو دیکھ کر چوہدری تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا۔''دعا فرمایئے قبلہ۔''وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی ابل آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور کہتا۔''وہی شافی مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا''۔لیکن ایک روز جب مولوی ابل چوہدری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔چوہدری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی۔آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا لیکن کراہا نہیں لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا۔''بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟''

''الحمدللہ۔اچھی ہیں،دعا گو ہیں۔''مولوی ابل نے جواب دیا۔

''سنا ہے بہت پیغام آرہے ہیں؟''چوہدری نے پوچھا۔

مولوی ابل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیغام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے۔تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا۔''جی ہاں بہت آرہے ہیں۔''

''پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟'' چوہدری مسلسل ابل کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی ابل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہٗ کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لئے تنکا تک نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کون طے کرتا پھرے۔''

''تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟'' چوہدری فتح داد کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

''آپ کے دشمن مریں۔'' مولوی ابل فوراً بول اٹھا۔''آپ اللہ جل شانہٗ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر بیٹھ کر طے کر لیں گے۔''

''جی ہاں۔'' چوہدری نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔''فوراً طے ہونا چاہیے، گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن صدی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا۔ وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' مولوی ابل نے جواب دیا۔''باقاعدہ۔''

''اللہ قبول فرمائے۔'' چوہدری فتح نے آہستہ سے دعا کی۔

''آمین۔'' مولوی ابل نے عادتاً اس دعا کی تائید کر دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چوہدری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا۔''سنا ہے بیٹی مہر النساء اور شمیم احمد کی خوب نبھ رہی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی۔''

''جی ہاں۔'' مولوی ابل نے بڑے دکھ سے کہا۔''لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے۔''

''پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟''

''بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے، تو سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے۔ تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے۔ تو اپنے ساتھ کیا لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔''

''ہوں۔'' چوہدری فتح داد کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔''بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد اس کے بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہر النساء کو کنگلی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہو گا تو اس کیلئے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھ جائے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے قبلہ؟''

ٹھیک ہے۔ مولوی ابل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور

کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النساء سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا۔ اور زیب النساء نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولنے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی ابل ڈیوڑھی ہی سے پکارا۔ ’’عارف کی ماں!‘‘

زیب النساء بھاگی آئی۔ ’’خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چوہدری کیا ہے؟‘‘

’’اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔‘‘ مولوی ابل بولا۔ ’’عارف کی ماں! سنو مہرن بیٹی کیسی ہے؟‘‘

زیب النساء چونکی۔ ’’تمہیں کس نے بتایا؟‘‘

’’کب تک ہوگا؟‘‘ مولوی ابل آج تو آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

’’بس اللہ چاہئے گا تو آج کل میں۔‘‘ زیب النساء جھینپ کر بولی۔ ’’پر تمہیں کس نے بتایا؟‘‘

مولوی ابل تقریر کے سے انداز میں بولا۔ ’’بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو ساس کے طعنوں تشنعوں سے چھٹکارا لا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لئے بہت سا۔۔۔۔۔۔۔۔۔‘‘

’’اللہ کرے نواسہ ہو۔‘‘ زیب النساء نے مولوی ابل کی بات کاٹ دی۔

’’جو کچھ بھی ہو۔‘‘ مولوی ابل نے ٹوٹے تار کو جوڑا۔ ’’ہم بچے کے لئے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کیلئے ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟‘‘ زیب النساء نے پوچھا۔

’’توکل عارف کی ماں توکل۔‘‘ مولوی ابل کے ذہن میں چوہدری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ ’’اللہ جل شانہٗ پر تکیہ کرو۔‘‘ مولوی ابل کو اس وقت چوہدری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقع اوڑھا، عارف کو ساتھ لیا اور مہر النساء کے ہاں چلی گئی، رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی۔ ’’جاگ رہے ہو عارف کے ابا۔‘‘

’’ہاں عارف کی ماں۔ کیوں!‘‘ مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

’’بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی۔ شمیم احمد رو رہا ہے، بے چارہ، شاید کل تک ہو جائے گا۔‘‘ زیب النساء نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

’’سچ اماں؟‘‘ زبدہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

’’ارے!‘‘ مولوی ابل اور زیب النساء حیران رہ گئے اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی، جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا، مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا، سارا گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النساء کے پاس آیا۔ ''اب کے اہو گا؟''

''چوہدری کیسا ہے؟'' زیب النساء نے پوچھا

''اللہ جل شانہٗ ہی رحم فرمائے۔'' مولوی ابل نے کہا۔

زیب النساء اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ ''طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو جھونکو بھاڑ میں میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک چولا چنی ہی بنوالیں تو ناک رہ جائے کوئی سبیل ہے؟''

''سبیل؟'' مولوی ابل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا۔ ''تمہاری عقل بھی تو ایڑھی میں ہے۔ اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے آخر ایک بھوکے مرجھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا۔ وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لئے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا۔''

''بکنے کیوں لگے؟'' زیب النساء بھی غصے میں بولی۔ ''کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ مٹکاتی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آ جاؤں، لعنتوں کی گٹھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا۔ جینا اجیرن ہو جائے گا بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے، زبدہ اور شمسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں ساری عمر کنوایاں بیٹھی رہیں گی۔''

''بیٹھی رہیں۔'' مولوی ابل طیش میں آ گیا۔ ''اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے؟ کچھ نہیں میرے پاس سمجھیں؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔'' مولوی ابل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آ جائے گا مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی۔ اور زبدۃ النسا اور شمسن النساء کے بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں کے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی، سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی اور زبدہ اور شمسن اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈ بھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔۔۔اب۔۔۔زیب النساء سے نہ رہا گیا، فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا۔ ''ادھر آؤ۔''

زیب النساء اٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب مولوی موم ہو چکا تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے۔'' زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

''مسجد میں۔'' مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

''کیوں گئے تھے؟''

''کیوں جاتے ہیں؟''

''کچھ سوچا؟''

''ہاں!''

''کیا سوچا؟''

''یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔''

''خالی ہاتھ؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

''یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟''

''یہی۔''

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

''سنو۔ زیب النساء بولی۔ ''کہیں سے دس روپے قرضہ مل جائے گا؟''

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے۔ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ابوالبرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لئے سوگز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا۔''

زیب النساء بڑی مہارت سے امڈے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی۔ ''چوہدری کیسا؟''

''وہیں جاتا ہوں۔'' مولوی ابل نے جماہی لے کر کہا۔ ''ذرا سا بھی اچھا ہوا تو مہرن کا ضرور پوچھے گا۔ ہوسکتا ہے اللہ جل شانہٗ کوئی سبیل پیدا کردے۔''

مولوی ابل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبدہ اور شمسن نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی۔ ''ابھی ٹھہرو بیٹی!'' زیب النساء یوں آہستہ سے بولی۔ جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے بولی تو کوئی چیز چھن سے ٹوٹ رہ جائے گی۔

''انتظار۔۔۔۔۔''

'''انتظار۔۔۔۔۔''

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی ابل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا۔ ''عارف کی ماں، اے عارف کی ماں۔''

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبدہ، شمسن، عارف، قمرن، عمدہ اور دوسرے بچے یوں نکلے جیسے کہ کمرے میں سے کسی بگولے نے انہیں اٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی ابل اسی بجتے ہوئے لہجے میں چلایا۔ ''مبارک ہو عارف کی ماں۔ تم نواسے کے چولے کو رو رہی تھی اور اللہ جل شانہٗ نے چولے، چنی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا۔۔۔۔ چوہدری فتح داد مر گیا ہے نا۔''

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا کہ بچے دہل کر رو دیئے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا۔ چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔

گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا،طرفین نے اپنی اپنی ''چوکیاں'' چن لی تھی۔''پڑ کوڈی'' کے کھلاڑی بدن پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔انہوں نے رنگین لنگوٹیں باندھ رکھی تھیں، ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے۔وسیع میدان کے چاروں طرف گپوں اور حقوں کی دور چل رہے تھے۔اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا۔مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں۔یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدت سے تیل چپڑ وا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا۔پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں اترے۔انہوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے گرد ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی۔''مولا کہاں ہے؟''

مولا کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھچے چلے آئے تھے۔مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں۔'' دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھائے بڑھنے لگے۔جما ہوا پڑ اٹوٹ گیا۔منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ پڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا۔مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہولئے۔۔۔۔اور پھر اتنے میدان میں سیروں بارود سے بھرا ہوا گولا ایک چکر دینے والے دھماکہ سے پھٹ پڑا۔ہر طرف سناٹا چھا گیا لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔اس نے پھندوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر۔''یا علی'' کا نعرہ لگانے کے لئے ہاتھ میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈا بن کر پڑی۔''مولے اسے مولے، بیٹے، تیرا باپ قتل ہو گیا۔''

پڑ ٹوٹ گیا۔ڈھول رک گئے۔کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ہجوم میں افراتفری پیدا ہو گی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی سینے سے

لگائے بھاگا آرہا تھا اور پھر اس کے پیچھے ایک خوفزدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہوسکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا لپکا جا رہا تھا۔ اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے۔ ''رک جا مولے۔''

مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لئے گئے اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے۔ ''تو آگے نہیں جائے گا مولے۔''

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر بولا آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟''

''مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ ''تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیے اور ناک بھی کاٹ ڈالیے میری، مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی۔ بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔''

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے۔ رنگ کا بڑا لڑکا بولا۔ ''آؤ بیٹے آؤ۔'' گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اگلوا ڈالوں تو قادر نام نہیں۔ میرا گنڈاسا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈنے چلے جاتے ہیں۔''

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا، مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا مگر پھر جکڑ جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید کو دونوں ہاتھوں میں بلند کئے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلائے۔ ''اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ورنہ بدبختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا۔ جاؤ۔ تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ، قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔''

لوگ سر جھکا کر ادھر ادھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تاجے سے پٹکا لے کر ادب سے گھٹنے چھپا لئے اور سیڑھیوں پر سے اتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لئے اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے۔''

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کے چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

''تم تو رو رہے ہو مولے؟'' تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا۔ ''تو کیا اب رووں بھی نہیں؟''

''لوگ کیا کہیں گے؟'' تاجے نے مشورہ دیا۔

ہاں تاجے!'' مولا نے دوسری بار بازو آنکھوں پر رگڑا میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے، میرے باپ کے خون پر مکھیاں اڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لئے!''

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں، وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اس کے باپ کی لاش کو تھانے اٹھا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ منہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اس کے پاس آئی اور ''شرم تو نہیں آتی۔'' کہہ کر منہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہو گی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہی ہونے لگا تھا کہ کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر ابل کر اس سے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لئے گاؤں سے نکلے، مگر جب وہ تھانے پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قل ہو اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانیدار سے انہوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا مگر تھانیدار نے انہیں سمجھایا کہ ''خواہ مخواہ اپنے باپ کے قتل کو ضایع کر بیٹھو گے کوئی عقل کی بات کرو۔ ادھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے ادھر تمہارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھونک آیا ہے؟''

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے لیکن دونوں قتلوں کا وافر چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں سے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا اور کہا۔ ''اس روز تم اور تمہارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا، تمہاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا تو ایسا لگا کہ گھوڑے کو بھی قتل کا پتہ چل گیا ہے۔ آندھی بن گیا خدا کی قسم، اسی لئے تو لاش ابھی تھانے نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر واپس بھی آ گیا۔''

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے مگر مولا کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادر کے گنڈاسے سے مرا تھا رنگا تو صرف ہشکار رہا تھا بیٹوں کو۔ رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتہ چلا کہ قادر اپنے کوٹھے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی، مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا۔ کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا۔ مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آ نکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی۔ اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی۔ ''ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بتیس دھاریں بخشوں گی۔ میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے۔ اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔''

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔اس کی مونچھوں میں دو دو بل آ گئے تھے،کانوں میں سونے کی دو بڑی بڑی مرکیاں جھجھانے لگی تھیں۔آنکھوں مین سرمے کی دھار کو کبھی کسی نے مٹا ہوا نہ دیکھا۔خوشبو دار تیل اس کے گھرے بالوں میں آگ کی قلمیں سی لگائے رکھتا۔ہاتھی دانت کا ہلالی کنگھا اتر کر اسکی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہبد کا کم سے کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا۔باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا اور اکثر اس کا ایک سرا گر کر زمین پر گھسٹنے لگتا اور گھسٹتا چلا جاتا۔مولا کے ہاتھ میں ہمیشہ اس کے قد سے بھی کہیں لمبی تیل پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے لگتی اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔اگر کبھی لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے،مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں۔جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے الانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا۔مولا اس وات ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسری دیوار کریدے جا رہا تھا۔اجنبی آیا اور لٹھ پر سے الانگ گیا۔ایکا ایکی مولا نے بھر کر ٹیک میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا۔"ٹھہر جاؤ چھوکرے،جانتے ہو تم نے کس کی لٹھ الانگی ہے؟یہ مولا کی لٹھ ہے۔مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور ہولے سے بولا۔"مجھے پتہ نہیں تھا مولے۔"

مولے نے گنڈاسا اتار کر ٹیک میں اڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا۔"تو پھر جا اپنا کام کر۔"اور پھر وہ لٹھ کر یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس،اس کی چال،اس کی مونچھیں اور مرکیں،اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز۔یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے۔لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی۔تیل پلی پتیل کے کوکوں سے اٹی ہوئی،لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹنا دینے والی لٹھ۔اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ٹیک تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے پھلے اور گلے کی راہ تکتا رہتا ہے،قادرے کے قتل اور مولا کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا اور گلے نے علاقے کے مشہور رسہ گیر چودھری مظفر الہٰی کے ہاں پناہ لی تھی۔جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کر کے لاتا۔چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں،وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا۔اور اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری مظفر کے قصبے کے قریب تک پہنچے تو جی میں کہتے۔"ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا"انہیں معلوم تھا کی اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک پہنچ گئے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشنوں کی بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔وہ چودھری کے خوف سے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر اور تھلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آ جاتے۔

''کھروں کے نشان یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!''

مولا نے چودھری مظفر اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اسے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں یہ چوہدری ہی ہے جو اس کی لٹھ الانگ سکتا ہے۔ لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے۔ کام کا نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا!''

تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا۔ ''اور نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں۔ اور میراثیوں نائیوں کی سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے لے کر ڈرانے لگی ہیں۔ لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں، کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں اللہ کرے تجھے مولا بیاہ لے جائے۔ سنتے ہو مولے؟''

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کودا تھا اس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا۔ ''اے تاجے، اپنا کام کر، گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پٹھے، تیرا جی چھوٹ گیا تو میری آنکھوں میں دھول کیوں جھونکتا ہے۔ جا اپنا کام کر۔ میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی۔۔۔۔ جا۔'' اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراسی کو ہانک لگائی۔ ''ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا الو کے پٹھے! جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا کیا چلم لا۔!''

تاجا پلٹ گیا۔ مگر گلی کے موڑ پر جا کر رک گیا اور مڑ کر مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جوانمردی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا ہوا تاجے کے پاس آ کر بولا۔ ''دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔ اس لیے کہ کسی زمانے میں تیری میری یاری تھی۔ پر اب یہ ٹوٹ گئی ہے تاجے، تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تو پھر ایسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چک جائے۔ میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں تک پہنچے گا۔ اس لئے جا اپنا کام کر، تیری میری یاری ختم۔ اس لئے مجھ پر ترس نہ کھایا کر۔ کوئی مجھ پر ترس کھائے تو آنچ میرے گنڈاسے تک جا پہنچتی ہے جا۔''

واپس آ کر مولا نے میراسی سے چلم لے کر کش لگایا تو سلفہ ابھر کر بکھر گیا۔ یک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لحہ تک وہیں چمکتی رہتی۔ میراسی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا کہ میراسی جل کھا کر رہ گیا تو ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا۔ ''ترس کھاتا ہے حرامزادہ۔''

اس نے چلم اٹھا کر سامنے دیوار پر پٹخ دی اور لٹھ اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر

گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں۔" کرتی واپس چلی گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں اس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی لانبی سرخ سرخ مرچوں کو چن رہی ہے۔ جو جھکتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے گر گئی تھیں۔

مولا سناٹے میں آ گیا۔ لٹھ کو لانگنا تو ایک طرف رہا۔ اس نے یعنی عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے۔ اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے۔ اور جب مولا نے کڑک کر کہا۔ "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہوں میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھری میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "کوئی سڑی لگتے ہو۔"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی۔ "اسی لئے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تو تم پر ترس آ گیا تھا۔

"ترس آ گیا تھا تمہیں؟ مجھ پر؟ مولا پر؟ مولا دھاڑا؟

"مولا" لڑکی نے گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا چونک گئی۔

"ہاں مولا۔ گنڈا سے والا" مولا نے بڑے ٹھسے سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سی مسکرا کر گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ مولا نے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا۔ "آ جاؤ ماسی آ جاؤ۔ میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا۔"

حواس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی۔ "کیا جھوٹ بکتے ہیں لوگ، کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے۔ پر تو نے میرے لئے اپنی لٹھ۔۔۔۔"

"کون کہتا ہے؟" مولا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب کہتے ہیں۔ سارا گاؤں کہتا ہے۔ ابھی ابھی کنوئیں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش۔۔۔۔"

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا۔ جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی۔ وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی عورتیں دروازوں تک آ گئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے کا ہی پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سن لی۔ پلٹی اور پھر وہیں جمی کھڑی رہ گئی۔ اس نے

بس اتنا ہی کیا کہ گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ چند مرچیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا'' مولا پکارا۔ ''کچھ نہیں کہوں تمہیں۔''

لڑکی بولی۔ ''میں ڈر کے نہیں رکی۔ ڈریں میرے دشمن۔''

مولا رک گیا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''بس اتنا بتا دو تم ہو کون۔۔۔۔ کون ہو تم؟''

لڑکی ذرا مسکرا دی۔

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی۔ ''یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر ہے راجو ہے مولا بخش!''

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا، اس کا ہاتھ ٹیک تک گیا اور پھر رسے کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولا نے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا۔ ''ٹھہرو راجو۔ یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ۔''

راجو رک گئی۔ مولا نے جھک کر ایک ایک مرچ چن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انہیں راجو کی گٹھری میں ٹھونستے ہوئے بولا۔ ''تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نہ راجو؟''

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہو لی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا۔ ''یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش۔''

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا۔ ''ماسی یہ لڑکی راجو کیا یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''یہیں کی ہے بیٹا اور نہیں بھی۔'' بڑھیا بولی۔ ''اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کہ کوئی دو ڈھائی کوس دور ایک ڈھوک بنا لی وہیں راجو اپنے باپ کے پاس رہتی ہے۔ تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے آ جاتی ہے اور بس۔''

مولا جواب میں صرف ہوں کہہ کر واپس چلا گیا۔ لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان تو صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا نا، اور راجو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی۔۔۔۔ اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی!''

اس واقعہ کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں، چراگاہوں میں پھر پھرا کر واپس آ جاتا ماں اس کے رویے پر چونکی۔ مگر صرف چونکنے پر اکتفا کیا۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں۔ وہ بھی جو بہا دیئے گئے اور وہ بھی بہائے نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولہا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان

ک چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورنے جا رہا تھا۔ یکا یک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً اٹھ کر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آ رہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں برچھیوں سے لیس تھے۔ بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں ہنکالے لئے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انہیں ٹوکا اور جواب میں انہوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ ''یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے۔ یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے۔ چوہدری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اف تک نہیں کرے۔!''

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چوہدری مظفر خود بنفس نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہا ہے۔ کڑک کر بولا۔ ''چوری کا مال گاؤں میں سے نہیں گزرے گا۔ چاہے یہ چوہدری مظفر کا ہو چاہے لاٹ صاحب کا، یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو اور اپنی جان کے دشمن نہ بنو۔'' اس نے لٹھ کر جھکا کر گنڈاسا کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا۔

''جاؤ۔''

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا۔ ''جا کر کہہ دو اپنے چوہدری سے کہ مولا گنڈاسے والے نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔''

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے کے تیور دیکھے تو چپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو گھر کر اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا کہ ''یہ سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں ان کے مالک پرسوں تک آنکلیں گے کہیں سے اور گاؤں کی عزت میری عزت ہے ماں۔!''

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافت طے کر کے کھوجیوں کی ناز برداریاں کرتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اور یہ سوچتے آ رہے تھے کہ اگر ان کا مال چوہدری کے حلقہ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا اور جب مولا ان کا مال ان کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں گلی میں جمع ہو رہا تھا اور اس ہجوم میں بھی راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جما کر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور پھر منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا۔ ''آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو۔''

''کیوں؟'' اس نے کچھ یوں کہا جیسے۔ ''میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں۔'' کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ ''میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور ترسوں بھی۔ ترسوں تھوم پیاز خریدنے آئی۔ پرسوں بابا کو حکیم سے پاس لائی۔ کل ویسے ہی آ گئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔''

''کل ویسے ہی کیوں آ گئیں؟'' مولا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''ویسے ہی بس جی چاہا آ گئی۔ سہیلیوں سے ملی اور چلی گئی کیوں؟''

''ویسے ہی۔۔۔۔'' مولا نے بجھ کر کہا۔ پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا۔ ''یہ گھی بیچو گی؟''

''ہاں بیچنا تو ہے۔ پر تیرے ہاتھوں نہیں بیچوں گی۔''

''کیوں؟''

''تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔''

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا اور اسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لئے مڑی تو مولا ایک دم بولا۔ ''دیکھو راجو میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا۔ پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے، میرے ہاتھ نہ بیچو میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔''

راجو کچھ سوچ کر بولی۔ ''چلو۔۔۔آؤ۔''

مولا آگے آگے چلنے لگا۔ جاتے جاتے اسے کیا وہم گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پٹوں کو گھورے جا رہی ہے۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ فوراً بولا۔ ''یہ چوزے میرے ہیں۔''

''ہوں گے۔'' راجو بولی۔

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا بولا۔ ''ماں یہ سب گھی خرید لو، میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔''

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تا کہ بڑھیا گھی سونگھ لے مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کر لیں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں۔ اور نتھوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی بجائے گلاب کے پھول سونگ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے۔ جو کچھ یوں اچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یونہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے۔

ماں ترازو لے کر آئی تو راجو بولی۔ ''پہلے دیکھ لے ماسی، رگڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر سونگھ لے پہلے۔!''

''نہ بیٹی میں تو نہ سونگھوں گی۔'' ماں نے کہا۔ ''میرا تو روزہ مکروہ ہوتا ہے۔ پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر بعد بولی۔

''تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟''

''ہاں۔''

''تو پھر جا۔۔۔'' ماں نے ترازو اٹھا کر ایک طرف پٹخ دی۔ ''تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا، رشتہ قتلوں کا اور

سودے گھی کے، جا!‘‘

پھر وہ مولا کی طرف مڑی۔ ’’جن پر گنڈ اسے چلانے ہیں ان سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان۔ یہ گلے کی منگیتر ہے۔ گلے کی، رنگے کے بیٹے کی!‘‘

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اٹھی اور بولی۔ ’’تمہارے سینوں میں دل ہے یا خشخاش کے دانے۔‘‘

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں نے اسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

’’تم رو رہے ہو مولے؟‘‘ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مولا بولا۔ ’’تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟‘‘

ماں کے چکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا۔ نورے نے وہاں چائے کی دوکان کھول رکھی تھی۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوان اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیور سے شہروں کی خبریں پوچھتے۔ اور مولا اس سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ لوگ اب مولا کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے پاس سے حقہ تک اٹھا لاتے تھے مگر کسی کو اس کی لٹھ چھونے یا الانگنے کی جرأت نہ ہوتی جو وہاں کھٹولے کیساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے لاری آ کر رکی اور اس میں سے مسافر اترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر الو بول گیا۔ لاری میں رنگے کا بیٹا گلا، اترا اس کے پیچھے چار بڑے قد آور گبرو اترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے۔

مولا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کیساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے تیزی سے چارپائی سے پاؤں لٹکائے اور ٹینک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا۔

’’حقہ لانا نورے۔‘‘ وہ پکارا۔ اور زرد رو نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقہ رکھ کر غڑاپ سے دکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نو وارد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اڑا دیا۔

’’مولے۔‘‘ گلے نے اسے للکارا۔

''کہو۔'' مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلے کی طرف اڑا دیا۔

''ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں۔''

''کہو کہو۔''

''گنڈاسا ایک طرف رکھ دو۔ہم بھی خالی ہاتھ ہیں۔''

''لو۔'' مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چمٹ کر رہ گیا۔بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

''کیا بات ہے؟' مولا نے گلے سے پوچھا

گلا جواب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا۔''تم نے چوہدری مظفر کا مال روکا تھا۔!

''ہاں۔'' مولا نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''پھر؟''

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا۔''چوہدری نے تمہیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ یہ انعام ان سارے گاؤں والوں سے سامنے تمہارے حوالے کر دیں۔''

''انعام۔'' مولا چونکا۔

''آخر بات کیا ہے؟''

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولے کے منہ پر مارا اور بجلی کی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔''یہ بات ہے۔''

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھائی۔ڈوبتے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔

پانچوں نوارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے مگر گلا لاری کی پرلی طرف کنگروں پر پھسل کر گر گیا۔لپکتا مولا رک گیا۔اٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس زاویے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا۔

دم بخود ہجوم دیوار سے اچٹ اچٹ کر آگے آ رہا تھا۔بچے آوے کی رکھ اڑاتے بھاگتے ہوئے اتر کا نوراد کان میں سے باہر آ گیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے سینے میں اتر جانا چاہتا ہے۔

اور پھر مولا جو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے سکتے میں آ گیا ہے۔ایک قدم آگے بڑھا۔لٹھ دور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دی اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا۔''چوہدری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے رسید میں خود پہنچانے آؤں گا۔''

اس نے ہولے ہولے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا۔

''رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمہیں تو ابھی دولہا بننا ہے ابھی۔۔۔۔اس لئے جاؤ اپنا کام کرو۔''

گلا سر جھکائے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا، جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آ کر نہایت وحشت سے بولنے لگی۔''تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے۔ارے تو تو میرا حلالی بیٹا تھا۔تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا۔تو نے۔۔۔!''

وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی۔''تو تر رو رہا ہے مولے؟''

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہولے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا۔''تو کیا اب روؤں بھی نہیں۔''